ٹوٹا ہوا پل
شہزاد احمد
بیگ راج
+92-307-7002092

ٹوٹا ہوا پل

شہزاد احمد

ٹوٹا ہوا پل

شہزاد احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۳

نیاز احمد نے

آر۔آر پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

ISBN 969-35-0089-X

کتابت : نذیر ہاشمی

ڈاکٹر سید اسلم کے نام

ترا کرم ہے کہ تُو نے مجھے عطا کر دی
وہ زندگی جو کسی اور کو نہ چاہی تھی

غزلیں

اِک پَل بھی ساری عمر میں آرام کا نہ تھا
وہ دِل مجھے مِلا جو کِسی کام کا نہ تھا

کِھلنے کو کِھل رہے تھے گُلِ تازہ ہر طرف
اِک پھُول بھی چمن میں مِرے نام کا نہ تھا

اِک دوسرے کے حال سے واقف تھے اہلِ حال
گو ان میں ربط نامہ و پیغام کا نہ تھا

حدِ اُفق پہ خونِ شفق کی نمود تھی
منظر مگر نظر میں کسی شام کا نہ تھا

جتنے بھی داہمے تھے تراشے تھے مَیں نے خود
یہ معجزہ تو گردشِ ایّام کا نہ تھا

ہم خوش ہُوئے تھے رزقِ فراواں کو دیکھ کر
احساس بھی بچھائے ہُوئے دام کا نہ تھا

——— ۲۔ جون ۸۴ ۱۹ء

ہے انتظار کی شب، رات کیسے ڈھلنے دوں
ہو اختیار تو سورج ہی کیوں نکلنے دوں

نصیبِ راہروی تیرگی بھی جس بھی ہے
چراغ بھی نہ بجھاؤں، ہوا بھی چلنے دوں

مرے سمیت اگر قدر دان کوئی نہ ہو
سمندروں میں پڑے موتیوں کو گلنے دوں

ثمر نصیب میں ہو گا تو مل ہی جائے گا
جو شاخ پھوٹ رہی ہے اسی کو پھلنے دوں

وہی بھنور ہے وہی منزلِ مراد بھی ہے
مَیں اپنی ناؤ کو رُخ کس طرح بدلنے دوں

مری وفا کا تقاضا یہی تو ہے شہرآد
جو شمع اس نے بُجھائی کبھی نہ جلنے دوں

——— ۲۴- جون ۱۹۸۴ء

پَل میں جُگ پر جُگ بیتا ، جب نکلی بات سے بات
وصل کی شب اور ایسی لمبی، جیسے ہجر کی رات

دیکھے نہیں جاتے تھے مجھ سے مانگنے والے ہات
اب کے برس تو آنکھیں ہی مَیں نے کر دیں خیرات

دستک دیتے جاؤ لیکن بولنے والا کون ؟
کہنے کو تو اس بستی کے دروازے ہیں سات

میرے سمیت زمیں پر کوئی چاروں اور نہیں
خاموشی ہے، تنہائی ہے اور خدا کی ذات

کبھی کبھی فرزانے پن کو اچھا لگتا ہے
جان بوجھ کر سر ٹکرانا دِیواروں کے سات

ممکن ہے مَیں ڈوب ہی جاؤں دن دریا چڑھنے تک
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے میرے دل میں رات

جتنے بند تھے اِک اِک کر کے سارے ٹُوٹ بہے
اب کے ایسا برسا پانی ڈوب چلی برسات

تُو ہے اُڑتے پل جیسا تیز آندھی تری باندی
مَیں ذرّہ تری راہ کا پیارے میری کیا اوقات

گھر سے مَیں تو سب دیواریں ڈھانے نکلا تھا
اب آرام سے بیٹھ گیا ہوں توڑ کے دونوں ہات

یہ بھی درست کہ اس کو بھلانا اپنے بس کی بات نہیں
لیکن یاد کریں گے اس کی کون کون سی بات

سب کا دُکھ سہنے والا دِل تُو نے مُجھ کو دان کیا
ہر شے چُھونے والی آنکھیں، دیکھنے والے ہات

——— ۷۔ نومبر ۱۹۸۴ء

ذرا ذرا سی باتوں پر، اس دل کو ٹوکا مَیں نے بھی
دُکھ بھی جی بھر کر نہیں جھیلا، سُکھ نہیں پایا مَیں نے بھی

اس نے بھی اس تنہائی کو سوتے جاگتے کاٹا ہے
گِنا نہیں ہے اس پت جھڑ کا پتّہ پتّہ مَیں نے بھی

سوچ سمندر کی سب لہریں دیواروں سے ٹکرائیں
سب کچھ جانا اور اس پر بھی کچھ نہیں جانا مَیں نے بھی

سُورج بھی چھتری کی طرح میرے ہی سر پر کھُلا رہا
طے نہ کیا جنگل کے سفر کو سایا سایا میں نے بھی

جو کچھ مجھ کو نظر آتا تھا ' مَیں نے سراب ہی جانا تھا
مَیں نے بھی نہیں پیاس بُجھائی ، دیکھا دریا مَیں نے بھی

ساری عمر پڑھا ہے مَیں نے علم کے کورے کاغذ کو
وہی عبارت نقش ہے دل پر' ورق نہ اُلٹا مَیں نے بھی

میرے اس کے رشتے کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے
اس نے بھی سب کچھ ہی دیا ہے' کچھ نہیں مانگا مَیں نے بھی

کیسے کیسے خواب دکھائے پاؤں کو زنجیروں نے
خاک اُڑانے کی خواہش کی صحرا صحرا مَیں نے بھی

میرے جیسے بھی دیوانے کم ہی دکھائی دیتے ہیں
دوسرا کوئی نہیں دیکھا ہے تیرے جیسا مَیں نے بھی

آتی رُت نے جاتی رُت کے دُکھ پھر سے دُہرانے ہیں
طے کرنا ہے باقی عُمر کا لمحہ لمحہ مَیں نے بھی

اِن گلیوں نے بھی جی بھر کر پاؤں میں چھالے ڈالے ہیں
چھان لیا ہے اِس بستی کا کوچہ کوچہ مَیں نے بھی

۹۔ نومبر ۸۴ء ———

تمھارے بعد ان پھولوں کو کھلنا کیوں نہیں آیا
وہی دھرتی وہی سورج ، سویرا کیوں نہیں آیا

وہی برسات کا موسم ، وہی چھائے ہوئے بادل
وہ رُت لوٹ آئی ہے لیکن وہ لمحہ کیوں نہیں آیا

ملاقاتیں ہوئیں ، باتیں ہوئیں ، گھُل مل گئے دونوں
مگر دِل میں اُتر جانے کا موقعہ کیوں نہیں آیا

سفر جتنا بھی تھا دریا کے اُلٹے رُخ کیا مَیں نے
مجھے موجِ بلا کے ساتھ چلنا کیوں نہیں آیا

فلک پر چاند بھی، سُورج بھی، ستارے بھی آئے ہیں
مَیں جس کا منتظر تھا وہ ستارہ کیوں نہیں آیا

حصارِ وقت کے توڑے نہیں دیوار و دَر مَیں نے
مجھے اِس خول سے باہر نکلنا کیوں نہیں آیا

مرے دل میں سفر کرنے کی خواہش کیوں نہیں جاگی
مری جانب تری خوشبو کا جھونکا کیوں نہیں آیا

اُفق پر شام کی سرخی ہزاروں بار پھیلی ہے
مگر بھُولے ہُوئے کو گھر کا رستہ کیوں نہیں آیا

کئی بھُولے ہُوئے قِصّے، کئی بِسری ہوئی باتیں
بہت کُچھ ساتھ لے آیا وہ تنہا کیوں نہیں آیا

———— ۱۰- نومبر ۱۹۸۴ء

دل میں اس کا دھیان کبھی مت آنے دے
دُنیا چہرے پڑھ لیتی ہے ـــ جانے دے

اس کی یادوں کے دفتر بھی کھول ضرور
لیکن پہلے سُورج تو چھُپ جانے دے

اے دل آج ہی ہر دُکھ کا اظہار نہ کر
کُچھ آنسُو تو کل کے لیے بچانے دے

نئے شگوفے جلد ہی کھِلنے والے ہیں
جو کچھ باقی ہے مٹّی ہو جانے دے

اے دل والے اپنے دل کی بات نہ سُن
ناخن ہی کو ہر گتھّی سُلجھانے دے

اپنی ذات پہ سارے رَستے بند نہ کر
تازہ ہَوا کِسی روزن ہی سے آنے دے

رُوکھی سُوکھی نیندوں سے کیا ہوتا ہے
دینے والے مجھ کو خواب سہانے دے

جب تک دل زندہ ہے غم بھی زندہ رکھ
جب تک سر ہے سلامت پتھّر آنے دے

کہہ وہ کچھ جو تیرے دل میں آتا ہو
جو کوئی سمجھاتا ہے سمجھانے دے

دونوں ہی دُنیاؤں کو پائندہ رکھ
صبر دِلوں کو، آنکھوں کو ویرانے دے

سُورج کا کیا ہے جانے کب چُھپ جائے
دِن کو بھی راہوں میں دِیے جلانے دے

——— ۱۱- نومبر ۱۹۸۴ء

بُت شکن ہو تو یونہی بُت شکنی کرتے رہو
جہاں رکھی ہیں جبینیں وہاں پاؤں رکھ دو

چھینتے پھرتے ہو کیوں راہ نوردوں کے چراغ
کفر کرنا ہے تو سورج ہی سے انکار کرو

جہاں جاتے ہو قفس ساتھ لیے جاتے ہو
سَیرِ عالَم کے لیے جسم سے باھر نکلو

گفتگو اس سے ہو جو بات کی تہ تک پہنچے
داستانِ شبِ تاریک اندھیروں سے کہو

آتشِ شوق کسی طور نہ بجھنے پائے
تم سمندر ہو تو اس آگ کو سیراب کرو

ق

یہ کوئی رُت ہے کہ انسان گھروں سے نکلیں
دھوپ کہتی ہے کہ دل پر ابھی قابو رکھو

چھپ گیا ابر میں خورشید تو پھر دل نے کہا
یہ برستا ہُوا موسم تو گزر جانے دو

دستکیں دیتا ہے دروازے پہ سورج شہزاد
اب اسے ایک نیا دن کہ نیا سال کہو

——— ۳۱۔ دسمبر ۱۹۸۴ء

جو نقش ہَواؤں پر بنا ہے
آنکھوں کے بغیر دیکھنا ہے

دیوار جو توڑ آئے تھے ہم
پھر آج اسی کا سامنا ہے

بہتر ہے کہ تُو ہی سنگ تن ہو
آخر تو ہمیں بھی ٹُوٹنا ہے

کرنا اس سے کرم کی خواہش
آندھی سے چراغ مانگنا ہے

جو سحر کیا ہے ہم نے طاری
وہ سحر ہمیں کو توڑنا ہے

سورج سے کہو یہیں ٹھہر جائے
ہم نے سائے کو ناپنا ہے

درپیش ہو شب کہ روزِ روشن
آنکھوں کا کمال جاگنا ہے

اِک بھیڑ سی ہے قدم قدم پر
دل کا جنگل بہت گھنا ہے

یکتا ہُوں مَیں جس ہُنر میں شہزادؔ
مُجھ کو وہ ہُنر بھی سیکھنا ہے

۲۔ جنوری ۱۹۸۵ء

وہ جس کا ہر طرف چرچا ہُوا ہے
نہیں دیکھا مگر دیکھا ہُوا ہے

کوئی موجود تھا لیکن کہاں تھا
بہت خالی ہے دِل یہ کیا ہُوا ہے

نظر آتی تھی وہ تصویر جس میں
وہی تو آئینہ ٹُوٹا ہُوا ہے

پلٹ کر وہ تو شاید آ ہی جاتا
ہمیں نے راستہ روکا ہُوا ہے

ہَوا کا شور یا شب کی اُداسی
ہر اِک شَے پر ترا دھوکا ہُوا ہے

زمانہ ہو گیا لیکن ترا نام
اسی دیوار پر لکھا ہُوا ہے

ستاروں سے ہُوا احساس مُجھ کو
اندھیرا دُور تک پھیلا ہُوا ہے

عجب موسم تھا جب اس سے مِلے تھے
وہ بادل آج تک چھایا ہُوا ہے

جُدائی بھی اسی دن ہو چکی تھی
بہت دن بعد اندازہ ہُوا ہے

اسی میں غرق ہے ساری خُدائی
اِک آنسُو آنکھ میں ٹھہرا ہُوا ہے

کہیں کیا کِس طرح اس کو بتائیں
ذرا سی دیر میں کیا کیا ہُوا ہے

کنارے سیلِ غم میں بہہ چُکے ہیں
جو پُل موجود تھا ٹُوٹا ہُوا ہے

بڑھی ہے اس قدر دُوری کہ شہزاد
وہ چاند اب اَور بھی چمکا ہُوا ہے

۳۰ مارچ ۱۹۸۵ء

جس سے تو بات کرے جو ترا چہرہ دیکھے
پھر اسے شہر نظر آئے نہ صحرا دیکھے

روشنی وہ ہے کہ آنکھیں نہیں کھُلنے پاتیں
اب تو شاید ہی کوئی ہو جو اُجالا دیکھے

اس بھرے شہر میں کِس کِس سے کہوں حال اپنا
میری حالت تو کوئی دیکھنے والا دیکھے

دیکھتا رہتا ہُوں مَیں نقشِ کفِ پا کی طرف
اور اگر میری طرف نقشِ کفِ پا دیکھے

سب گئے وقت کو ہمراہ لیے پھرتے ہیں
کوئی ایسا بھی کہ جو ساعتِ فردا دیکھے

چھوڑنے مَیں نہیں جاتا اُسے دروازے تک
لَوٹ آتا ہُوں کہ اب کون اُسے جاتا دیکھے

عجب اِک خانہ خرابی ہے کہ یہ دل خود کو
رات بھر جمع کرے صُبح کو لُٹتا دیکھے

اپنی رسوائی کے منظر تو بہت دیکھ لیے
نہیں معلوم کہ یہ آنکھ ابھی کیا کیا دیکھے

خاک ہو جائیں بھرے شہر میں عزت والے
اور روندی ہوئی مخلوق تماشا دیکھے

مُنہ چُھپانے کا بھی موقع نہ میسّر آئے
اہلِ دُنیا کی وہ ذِلّت ہو کر دُنیا دیکھے

سائے کی طرح مرے ساتھ ہے دُنیا شہزادؔ
کیسے ممکن ہے کہ کوئی مجھے تنہا دیکھے

——— ۴-اپریل ۱۹۸۵ء

جب زبانیں گُنگ ہوں گی پیچ اٹھیں گے حواس
پھر کوئی کیسے نہیں آئے گا گمراہوں کے پاس

جس نے پہلی بار انگاروں پہ کاٹا ہے یہ دن
رات بھر کانٹوں پہ تڑپے گی وہ جانِ ناسپاس

آج کی تصویر میں منظر ہمارے دل کا ہے
ہر طرف ٹوٹی ہوئی بے جان شاخیں، زرد گھاس

پیشِ آئینہ سبھی کچھ جو پسِ آئینہ ہے
چاپ آتے جاتے رنگوں کی لکیروں کے لباس

کیا کروں روزِ ازل سے مَیں اسی عالم میں ہُوں
اور میرے زخم کا مرہم نہ امیدیں نہ یاس

ایسی تنہائی میں تو ہوتی ہے خاموشی بھی شور
کچھ زیادہ ہی کھنکتا ہے مرا خالی گلاس

دیکھنے کے واسطے باقی ہی کیا اب رہ گیا
وہ بھی تم نے لے لیے جو خواب تھے آنکھوں کے پاس

تُو اگر چاہے بھی تو دامن چھُڑا سکتا نہیں
ایک پَل میں ٹُوٹ جائے کس طرح صدیوں کی آس

آنکھ کو خیرہ تو کرتی ہے پسینے کی چمک
لیکن ان دریاؤں سے بجھتی ہے کب مٹّی کی پیاس

شہر کی دیوار تو بے کار ہی ثابت ہُوئی
پھر وہی جنگل کی سرمستی وہی آنکھیں اُداس

مَیں وہ بادل ہُوں جسے احساس تک اپنا نہیں
میرے دُکھ دُنیا کی خاطر اور دُنیا ناشناس

——— ۲ مئی ۱۹۸۵ء

بندھا ہُوا وہ تصوّر ترے جمال کا ہے
گزر رہا ہے جو لمحہ ہزار سال کا ہے

ہر ایک سمت سے آتی ہے تیری ہی خوشبو
ہر اک زمانہ ، زمانہ ترے وصال کا ہے

مجھے خبر ہے کہ سارے زمانے تیرے ہیں
یہ تذکرہ کسی ماضی کا ہے نہ حال کا ہے

کریں گے اپنے لیے اِک نیا جہاں تخلیق
کہ یہ زمانہ کسی اور ہی خیال کا ہے

بھٹک گیا کسی جنگل میں کارواں جیسے
بہت دنوں سے عجب حال ماہ و سال کا ہے

چراغ سی نظر آنے لگی ہے مہر کی لو
ہُوں سجدہ ریز کہ یہ وقت بھی زوال کا ہے

ق

ستاروں پر بھی چمکتے ہیں نقشِ پا تیرے
یہ آفتاب بھی سایا ترے جلال کا ہے

دِکھائی دیتا ہے دِل میں بھی صُبح کا عالَم
یہ عکس بھی ترے چہرے کے خد و خال کا ہے

نظر میں جچتی نہیں رنگ رنگ کی دُنیا
یہ دِل اسیر کسی اَور ہی خیال کا ہے

کسی سے کیسے کہوں اور کسی سے کیا مانگوں
میں جانتا ہوں پتہ ان کو میرے حال کا ہے

قلم لرزتا ہے نعتِ رسولؐ لکھتے ہوئے
مگر یہ عجز بھی مظہر کسی کمال کا ہے

——— ۱۴- نومبر ۱۹۸۵ء

کبھی دھوپ نہیں ہے سورج میں، کبھی دھوپ میں پیڑ کا سایا نہیں
مَیں ایسے شہر میں رہتا ہُوں، جو ابھی وجود میں آیا نہیں

جب تیری ساری پُونجی کو، دُنیا نے تجھ سے چھین لیا
اے جاتے لمحے تُو ہی بتا، کیوں تُو نے شور مچایا نہیں

کہتی ہے بیزاری کی ہوا، مَیں کچھ بھی نہیں یادوں کے سوا
ہر زخم سنبھالے رکھا ہے، کچھ ہاتھ سے مَیں نے گنوایا نہیں

ماضی کے قصّے سُنتے رہے، یا فردا پر سر دھنتے رہے
جس حال میں ساری عمر کٹی، وہ حال کسی کو بتایا نہیں

ہر موڑ پہ ہر چوراہے پر، مجھے آنکھیں دھوکا دیتی ہیں
مَیں اپنے شر سے ڈرتا ہُوں، مَیں دشمن سے گھبرایا نہیں

یہ ہر سُو دھند کی دیواریں، جو ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں
سب اِک عالم میں رہتے ہیں کوئی سایہ نہیں ہمسایہ نہیں

جو گھر سے چلے تو آنگن، خوشبو نے بھی مُنہ موڑ لیا
قابو میں رہی ساری دُنیا اور ذرّہ بھی ہاتھ آیا نہیں

۲۰ نومبر ۱۹۸۵ء

بے سبب آج بہت زور سے دل دھڑکا تھا
نہ ملاقات ہوئی تھی نہ اسے دیکھا تھا

اے مری راتوں کو آسیب بنانے والے
اس قدر ٹوٹ کے کس کس نے تجھے چاہا تھا

یوں تو دیوانے ہزاروں تھے مگر میرے سوا
کون اس دشتِ ملامت میں قدم رکھا تھا

کسی صحرا کی طرح خشک تھیں دونوں آنکھیں
کھُل کے روتے بھی مگر رونے سے کیا ہوتا تھا

ایک رسوائی ابھی اور تھی دیوانے کی
اس لیے مر نہیں پایا کہ تجھے مِلنا تھا

جس کو سمجھا تھا ترے پاؤں کی آہٹ مَیں نے
وہ کوئی اور کوئی اَور بھی ہو سکتا تھا

اب یہ سمجھو نہ مِلے تھے نہ محبّت کی تھی
یاد کرتے بھی تو اس ذِکر میں کیا رکھّا تھا

خود کو ہر اِک سے جُدا سب سے یگانہ نہ سمجھ
آئینے میں بھی کوئی شخص ترے جیسا تھا

چھلک اُٹھتیں نہ کہیں جھیل سی آنکھیں تیری
کیا دکھاتا کہ مِرا زخم بہت گہرا تھا

دِن کے ہنگامے ہمیں بات نہ کرنے دیتے
رات جب جاگنے لگتی تو وہ سو جاتا تھا

سربلندی کے بہت زعم تھے دل میں جب تک
ابر نے خاک کے پیروں کو نہیں چوما تھا

نہ مرے پاؤں میں ہمّت تھی سفر کرنے کی
نہ مرا شہر کے ہنگاموں میں جی لگتا تھا

مَیں نے آغاز کیا تھا وہ سفر بھی شہزادؔ
جب مری راہ میں دُنیا نہ غمِ دُنیا تھا

۱۴- جنوری ۱۹۸۶ء ——————

کام ہارے ہوئے لشکر سے نکالا جائے
اب کے شعلہ اسی پتھر سے نکالا جائے

بہتے دریاؤں میں بے سُود ہے گوہر کی تلاش
اب صدف دل کے سمندر سے نکالا جائے

منزلِ دید نہیں دُور مگر شرط ہے یہ
راستہ آنکھ کے اندر سے نکالا جائے

دِل تو دیوانہ ہے حق مانگ نہ بیٹھے اپنا
ایسے دیوانے کو محشر سے نکالا جائے

کیسے جاؤں ترے دربار میں مَیں خالی ہاتھ
عشق سودا ہے تو کیوں سر سے نکالا جائے

سوچتا ہُوں کہ یہ منظر نہ بدل جائیں کہیں
کِس طرح آنکھ کو منظر سے نکالا جائے

دل سے ہم کیسے نکالیں گے تمنّائے وصال
گھر کا دشمن بھی نہ جب گھر سے نکالا جائے

——— ۲۲- فروری ۱۹۸۶ء

یوں تو اس بزم میں کر دی تھی خطا کرنے کو
پھر مرے ہاتھ میں کچھ بھی نہ رہا کرنے کو

ایسے کھوئے ہیں کہ ملتا ہی نہیں اپنا سراغ
آئے تھے دہر میں ہم تیرا پتا کرنے کو

اے خدا گزری ہے اس دل پہ قیامت کیا کیا
اور محشر ابھی باقی ہے بپا کرنے کو

یاد تھیں جتنی دُعائیں وہ نچھاور کر دیں
اب تو آنسو بھی نہیں تجھ پہ فدا کرنے کو

پھڑپھڑاتا ہے جو دن رات مرے سینے میں
اب یہی ایک پرندہ ہے رِہا کرنے کو

یاد آیا کہ ترا شُکر ہے واجب ہم پر
ہم نے تو ہاتھ اُٹھائے تھے دُعا کرنے کو

یوں لگا جیسے زمیں پاؤں کے نیچے نہ رہے
کیا ملاقات ہُوئی کُچھ نہ رہا کرنے کو

کیا ضروری تھا کہ بجلی مرے دل پر گرتی
اتنے عالم ہیں تیرے پاس فنا کرنے کو

تجھ سے بھی مانگنے کو جی نہیں چاہا اپنا
اور ترے پاس سبھی کُچھ تھا عطا کرنے کو

اس کی قسمت میں کہاں ہیں تری گالوں کے گلاب
شفقِ شام بھی کرتی ہے حیا کرنے کو

ہجر کی رات ہی شاید مری مونس ٹھہرے
ساعتِ وصل تو آتی ہے جُدا کرنے کو

ظلم کرتے ہُوئے رویا بھی مرے حال پہ وہ
پھر مرے واسطے کچُھ بھی نہ بچا کرنے کو

۲۶ - فروری ۱۹۸۶ء

شبِ غم سَیلِ گریہ دیدۂ تر سے نکلتا ہے
مگر یہ کیسا دریا ہے سمندر سے نکلتا ہے

کٹھن ہے دشت و صحرا کی مسافت ـــ خاک طے ہو گی
مسافر تو تھکا ہارا ہُوا گھر سے نکلتا ہے

زمانے بھر کے غم کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتے
وہ دُکھ جھیلا نہیں جاتا جو اندر سے نکلتا ہے

ٹھہرتا ایک بھی منظر نہیں ویران آنکھوں میں
ہمارے شہر سے بادل بھی بے برسے نکلتا ہے

فلک ویسے تو بھر جاتا ہے ہر شب چاند تاروں سے
مگر میرا ستارہ تو مقدّر سے نکلتا ہے

دلِ دیوانہ آخر اس کے چکّر میں پڑا کیوں تھا
مگر اب دیکھیے کب اس کے چکّر سے نکلتا ہے

دلِ برباد کی رونق نہیں دیکھی گئی مُجھ سے
مَیں یوں نکلا ہُوں جیسے کوئی محشر سے نکلتا ہے

یہ دُنیا ہی سہی اس سے کرم کی بھیک کیوں مانگوں
مَیں سجدہ کیوں کروں جب کام ٹھوکر سے نکلتا ہے

مجھے معلوم ہے راتیں بہت تاریک ہوتی ہیں
مگر وہ رات جب مہتاب ساغر سے نکلتا ہے

۱۳ - مارچ ۱۹۸۶ء

جسے بار بار مِلے تھے تم وہ مرے سوا کوئی اور تھا
مرے دِل کو تابِ نظر کہاں، تمھیں دیکھتا کوئی اور تھا

مَیں فریب خوردۂ راہِ غم، چلا سب کے ساتھ قدم قدم
مرے ہمسفر نہیں جانتے، مرا راستہ کوئی اور تھا

گُلِ تازہ یہ ترا رنگ و بُو، ہُوا سب سے بڑھ کے ترا عدُو
کِسی اَور نے تُجھے چُن لیا، تجھے چاہتا کوئی اور تھا

کبھی ربط بے سروپا ہوئے، نہ مِلے نہ تجھ سے جُدا ہوئے
نہ الگ تھا تیرا جہاں کوئی، نہ مِرا خُدا کوئی اور تھا

کُھلا ہمدموں پہ یہ راز کب، مَیں تھا ایک عمر سے جاں بلب
مجھے روز مِلتے تھے لوگ سب، مگر آشنا کوئی اور تھا

کبھی روشنی مجھے کی عطا، کبھی سائے ساتھ لگا دِیے
کبھی سب چراغ بجھا دِیے، وہ تمہی تھے یا کوئی اور تھا

——— ۱۰- جولائی ۸۶ ۱۹ء

مدھ بھری جتنی آنکھیں بھی تھیں، تم سے ملتی رہیں مُسکرا کر
اب بتاؤ کہاں جاؤ گے، یہ گناہوں کی گٹھڑی اُٹھا کر

دل کی محرومیوں کی بلائیں، اور تنہائی کی سائیں سائیں
نیند کیسے تمھیں آئے گی، نیند سے اتنے فتنے جگا کر

یہ بھی مانا کہ فن کار ہو، ساری دُنیا سے بیزار ہو
کون سا بُت بناؤ گے تم، ریت میں آنسوؤں کو ملا کر

زندگی تھی بہت بے مزا ، دیکھنے کو نہ کچھ بھی رہا
شہد میں گھول کر پی گئے، آنکھ کی پُتلیوں کو جَلا کر

شور کیسا بھی کرتے پھریں، زور دریاؤں میں بھی نہیں
اُلٹے پاؤں پلٹ آئے ہیں، آگے جانے کا رستہ نہ پا کر

جن کو دعویٰ ہے دیدہ وری کا، کام یہ ان کے بس کا نہیں ہے
جن کی آنکھیں نہیں میرے مولا، منظروں سے انھیں آشنا کر

——— ۲۶-اگست ۱۹۸۶ء

اپنے سوا کِسی سے کبھی بات ہی نہ کی
ہم نے اِک عمر ذہن کے اندر گزار دی

اٹھتی ہے کِس لیے مرے دِل میں تری امنگ
کیوں پیچ و تاب کھاتی ہے رسّی جلی ہُوئی

شوقِ سفر کہاں سے کہاں لے گیا ہمیں
ہم جس کو چھوڑ آئے ہیں منزل وہی تو تھی

پھر اہلِ بزم اپنے اندھیرے میں غرق ہیں
مانندِ شمع آنکھ جلی اور بُجھ گئی

بس ایک اشک حاصلِ توفیقِ عشق ہے
کل اتنا اختیار تھا آج ایسی بے بسی

سورج طلوع ہوتا ہے روز آسمان پر
جو رات جا چکی ہے پلٹ کر بھی آئے گی

بس ایک بار کیوں نہ سبھی کچھ لٹا دیا
کس کام آئے گی یہ محبّت رہی سہی

اب دشتِ آرزو کا سفر کیسے طے کریں
جب روشنی چراغ سے آگے نہیں چلی

شہزادؔ ان لبوں کا بھی احسان مند ہوں
جو دے گئے ہیں درد میں لپٹی ہوئی خوشی

——— یکم ستمبر ۱۹۸۶ء

کہنے کو اطاعت کے سفر پہ ہیں رواں ہم
لیکن نہیں معلوم بھٹکتے ہیں کہاں ہم

وہ دشت بھی اک شہر تھا جس دشت میں تھے آپ
یہ شہر بھی ویرانہ ہے، بیٹھے ہیں جہاں ہم

جس جنگ میں حق خون کے دریا میں نہایا
اس جنگ کی ٹوٹی ہوئی بیکار کماں ہم

پھر تیرہ و تاریک ہُوئی ساری خُدائی
پھر ڈھونڈتے نکلیں انھیں قدموں کے نشاں ہم

موجود ہے جو چیز بھی ہے آپ کے بس میں
ہم ذرّۂ ناچیز، زماں ہم، نہ مکاں ہم

تشنہ لبی اِک پَل کی بھی جھیلی نہیں جاتی
اے پیاسوں کے سردار کہاں آپ کہاں ہم

لگتا ہے ابھرنے کو ہے اس دل سے بھی سُورج
اب کیسے کہیں رکھتے تھے کیا کیا نہ گماں ہم

۷۔ ستمبر ۱۹۸۶ء

مُجھ کو جس شے کا یقیں تھا، تُو تھا
وہ ستارہ کہ نہیں تھا، تُو تھا

یوں تو کچھ حُسن کا مفہوم نہیں
پھر بھی جو سب سے حسیں تھا، تُو تھا

کہاں کھایا مری آنکھوں نے فریب
دامِ ہمرنگِ زمیں تھا، تُو تھا

کس نے ویران کیا تھا دِل کو
کون اس دل کا مکیں تھا ، تُو تھا

مُجھ سے گُم کردۂ منزل کا سراغ
گر کوئی زہرہ جبیں تھا ، تُو تھا

مُجھ کو تنہائی سے رغبت ہے بہت
جب کوئی ساتھ نہیں تھا، تُو تھا

ابھی بھڑکی تھیں چراغوں کی لویں
ہاں ابھی کوئی یہیں تھا ، تُو تھا

۲۷ - دسمبر ۱۹۸۶ء

ساغر جو اُٹھا کے رکھ دیا ہے
محفل کو بُجھا کے رکھ دیا ہے

چہرے اب خود کو ڈھونڈتے ہیں
آئینہ چُھپا کے رکھ دیا ہے

آنکھوں کے ذرا سے سانحے نے
دُنیا کو ہِلا کے رکھ دیا ہے

کس نے اِک جیتے جاگتے کو
آسیب بنا کے رکھ دیا ہے

سایا تری غم کی دوپہر نے
قدموں میں بچھا کے رکھ دیا ہے

یہ صُبح ہے ، پھُول ہے کہ تُو ہے
کیا سامنے لا کے رکھ دیا ہے

کیا دیکھتے گُل کی تازگی ہم
آنکھوں سے لگا کے رکھ دیا ہے

ہم کیا تری جستجو کریں گے
تُو نے تو مٹا کے رکھ دیا ہے

جس کے لیے سارے دُکھ سہے ہیں
دِل اُس نے دُکھا کے رکھ دیا ہے

اُڑنے کی بھی آرزو بہت تھی
اُس نے بھی اُڑا کے رکھ دیا ہے

جب مانگی ہے برف سے حرارت
سورج نے جلا کر رکھ دیا ہے

مٹی نے کیا قبول یعنی
مٹی میں رلا کے رکھ دیا ہے

دل خاک تھا یا دِیا تھا شہزاد
رستے میں ہوا کے رکھ دیا تھا

—— ۹- فروری ۱۹۸۷ء

چاند اگر جھیل میں اس رات نظر آ جاتا
آنکھ کو دل میں اُترنے کا ہُنر آ جاتا

یہ بھی ہو سکتا تھا، رستے سے بھٹک جاتے ہم
یہ بھی ممکن تھا کہ بھُولا ہُوا گھر آ جاتا

جستجو تو نے کہیں کا نہیں رکھا مُجھ کو
مَیں نہ چلتا تو مرے پاس شجر آ جاتا

یوں بھی ہوتا کہ کبھی تم مجھے مِلنے آتے
کہیں اس چین کی دیوار میں دَر آ جاتا

دہک اُٹھتیں کسی احساس سے کانوں کی لویں
نہ اسے دیکھ بھی پاتے تو نظر آ جاتا

ہو مرے ساتھ سفر کاٹنے والا کوئی
اِک ستارہ ہی سرِ راہگزر آ جاتا

بھاگتے وقت کا احساس تو ہوتا مُجھ کو
کوئی بھٹکا ہُوا لمحہ ہی ادھر آ جاتا

وہ اگر ابر کی مانند برستا مُجھ پر
پھر تو سوکھی ہوئی شاخوں پہ ثمر آ جاتا

خاک کے سینے میں گر لہر نمو کی سے چلتی
آنکھ میں اشک، سمندر میں گہر آ جاتا

پھر بھی محسوس مجھے تیری کمی ہوتی تھی
پیشوائی کو اگر سارا نگر آ جاتا

فرق کچھ بھی نہ پڑا تیرے مرے ہونے سے
پھر کوئی اور خدا اور بشر آ جاتا

سارے رستے کسی منزل کی طرف جاتے ہیں
میرے حصے میں کوئی اور سفر آ جاتا

اس کے آنے کی توقع تو نہیں ہے شہزاد
پھر بھی میں سوچ رہا ہوں وہ اگر آ جاتا

۲۱-فروری ۱۹۸۷ء ——————

کبھی اپنا ہی ہُوا ہے نہ ہمارا تُو ہے
دُور ہوتا ہُوا دریا کا کنارا تُو ہے

دشت میں راہ سے بھٹکا ہُوا راہی مَیں ہُوں
جو ابھی تک نہیں نکلا وہ ستارا تُو ہے

کیوں نہ اے دل تجھے گرتی ہُوئی دیوار کہوں
بے سہارا ہوں کہ اب میرا سہارا تُو ہے

یہ الگ بات کہ ہم تیری رضا سے ڈوبے
ڈوبتے وقت جسے ہم نے پکارا تُو ہے

پہلے بھی تیرے سوا کوئی نہیں تھا موجود
اب مری راہ کی دیوار دوبارا تُو ہے

ہم ہیں پتّوں پہ لرزتی ہوئی شبنم کی طرح
جو بدل ہی نہیں سکتا وہ نظارا تُو ہے

کُھل کے اے دوست کبھی کھیل نہیں پائے ہم
اور جو ایک بھی بازی نہیں ہارا تُو ہے

۲۵ - فروری ۱۹۸۷ء

مجھے بہت اچھی لگتی ہے
یہ دُنیا تیرے جیسی ہے

مَیں بھی وہی ہُوں تُو بھی وہی ہے
رُت ہی شاید بدل گئی ہے

ہم نے لمحے بانٹ لیے ہیں
دن تیرا ہے شب میری ہے

لاکھوں کوس مسافت لیکن
ایک مسافر ایک گلی ہے

دل کا سکوں بھی مانگا میں نے
اور تری بھی خواہش کی ہے

جانے پھر کب اس سے ملیں گے
وصل میں بھی اک محرومی ہے

اس کو ہی احساس نہیں تھا
جس کے لیے ہر رُت بدلی ہے

کوئی کڑوا بول ہی بولو
یہ چُپ بھی تو سنگ زنی ہے

دِل کی بات کا ذکر ہی چھوڑو
کِس نے کہی ہے کس نے سُنی ہے

زخم اگر گہرے ہو جائیں
آنکھ بھی روشن ہو سکتی ہے

دُنیا نے دیکھا ہے تجھ کو
اور تُو نے دُنیا دیکھی ہے

تنہائی میں رو لیتا ہُوں
یہ مہلت بھی کس کو ملی ہے

——— ۱۵-مارچ ۱۹۸۷ء

جس نے مجھے بینائی دی ہے
آنکھ کا نُور وہی مٹّی ہے

اوپر اوپر پھُول کِھلے ہیں
نیچے اِک سوکھی ٹہنی ہے

دل تک ہم کیسے پہنچیں گے
یہ دیوار بہت اونچی ہے

آنکھوں کے اندر مت جھانکو
اِن میں بَلا کی تاریکی ہے

اِک منظر مَیں دیکھ رہا ہوں
اُور اِک آنکھ سے اوجھل بھی ہے

دریا بھی سُوکھے رہتے ہیں
بارش بھی ہوتی رہتی ہے

کوئی نکلتا ہی نہیں گھر سے
اور ہَوا چلتی رہتی ہے

پلکوں سے آگے نہیں دیکھا
کہنے کو دُنیا دیکھی ہے

ویسے تو اِک پَل نہیں کٹتا
پَل میں عمر گزر جاتی ہے

ہم تو فقط ہیں دیکھنے والے
دل ہی فقیر ہے دل ہی غنی ہے

سورج ہے شہزادوں سروں پر
لیکن رات ابھی باقی ہے

——— ۱۵- مارچ ۱۹۸۷ء

میرے دیارِ شوق کی آب و ہوا ہی اَور ہے
آنکھ کو جستجو ہے اور دِل کی صدا ہی اَور ہے

کیسا بھی حال ہو زبوں، تجھ کو ہے میری فکر کیوں
تیرے خُدا سے کیا کہوں، میرا خدا ہی اَور ہے

کیسا پرند ہے خیال، چلتا ہے روشنی کی چال
دھیان سے کیسے دوں نکال، وہ تو بَلا ہی اَور ہے

زخم کوئی سِلا نہیں، وہ بھی مجھے مِلا نہیں
اب تو کوئی گِلہ نہیں، اب تو گِلہ ہی اَور ہے

قیدِ رسوم میں نہیں، مَیں تو ہجوم میں نہیں
میرے لیے تو اے خُدا، روزِ جزا ہی اَور ہے

وسعتِ ذات چاہیے، غم سے نجات چاہیے
اپنی طلب کو کیا کروں، اس کی رضا ہی اَور ہے

وصل ہوں یا جُدائیاں، دونوں ہیں جگ ہنسائیاں
جرمِ وفا کہیں جسے، اس کی سزا ہی اَور ہے

تجھ سے مِلے تھے کل کہاں، پھُول کھِلے تھے کل کہاں
آج سماں ہے مختلف، آج ہَوا ہی اور ہے

——— ۳۰- مئی ۱۹۸۷ء

جس کو کبھی چکھا نہیں ، اس کا مزا ہی اَور ہے
آپ بہشت مانگیے ، میری دُعا ہی اَور ہے

مانا کہ شش جہات پر ، اس کی ہیں سائبانیاں
مُجھ کو کہیں نہیں اماں ، میری خطا ہی اَور ہے

ایسا مرض ملا مجھے ، جس کا نہیں کوئی طبیب
جائے کہاں دلِ غریب ، اس کی دَوا ہی اَور ہے

میرا نصیب دیکھیے ، مَر کے بھی مَر نہیں سکا
دستِ قضا سے خوف کیا ، میری قضا ہی اَور ہے

ویسے تو لوگ سب کے سب مانتے ہیں اسی کو رب
ان کی گواہی اور ہے، میری گواہی اَور ہے

جس کی ہے جستجو مجھے، اس کا سراغ کچھ نہیں
چاند چراغ کچھ نہیں، دل کی فضا ہی اَور ہے

یونہی برہنہ سر نہ پھر، شہر میں چادریں بہت
جو ترے دل کو ڈھانپ لے، پھر وہ ردا ہی اَور ہے

رسم و رواج جو بھی تھے، سب ترے ساتھ ہو لیے
اب تو رہا ہی کچھ نہیں، اب تو روا ہی اَور ہے

اس قدر آگیا ہے فرق، سائے میں روشنی ہے غرق
بزم اداس کیوں نہ ہو، آج دیا ہی اَور ہے

——— ۳۰-مئی ۱۹۸۷ء

شہر کا شہر اگر آئے بھی سمجھانے کو
اس سے کیا فرق پڑے گا ترے دیوانے کو

جس قدر وہم ہیں سب اس کے عطا کردہ ہیں
لیے پھرتا ہوں کسی اور کے بُت خانے کو

یہ ہُنر وہ ہے جو دل سے کبھی سیکھا نہ گیا
تُو نے تو جوڑ لیا توڑ کے پیمانے کو

کیا کوئی کھیل ہے بے نام و نشاں ہو جانا
ویسے تو شمع بھی تیار ہے جل جانے کو

وہ عجب شخص تھا کل جس سے ملاقات ہوئی
مَیں مِلا ہُوں کِسی جانے ہُوئے اَنجانے کو

آج کے دُکھ بھی کِسی سے نہیں جھیلے جاتے
یاد مت کر کِسی بھُولے ہُوئے افسانے کو

ایک لمحہ بھی تو بیکار نہیں کٹ سکتا
ایک گُتھّی جو مِلی ہے مجھے سلجھانے کو

دُور تک رات کی آنکھوں میں کہیں نیند نہیں
اتنا سنّاٹا ہے آئے کوئی تڑپانے کو

زندگی بھر میں کوئی شَے تو مکمّل کر لیں
آؤ لبریز کریں صبر کے پیمانے کو

یہ الگ بات کہ اِک بوند مقدّر میں نہ تھی
سر پہ سو بار گھٹا چھائی رہی چھانے کو

شام ہونے کو ہے جلنے کو ہے شمعِ محفل
سانس لینے کی بھی فرصت نہیں پروانے کو

———— ۷- جون ۱۹۸۷ء

نظر اس آنکھ کو اپنے سوا کوئی نہیں آتا
کہاں جاؤں کہ مجھ کو راستہ کوئی نہیں آتا

یہی محسوس ہوتا ہے کہ اب صبر آگیا مجھ کو
زباں پر آج کل حرفِ دعا کوئی نہیں آتا

مجھے آئینے بھی اب اجنبی محسوس ہوتے ہیں
نظر بستی میں صورت آشنا کوئی نہیں آتا

ہر اِک شَے تیز لمحوں کی طرح اب اُڑتی جاتی ہے
بہت دن سے تہِ دامِ ہوا کوئی نہیں آتا

دمکتے داغِ گُل، پیاسے پرندے بھاگتے آہو
اب اس گُلشن میں اے بادِ صبا کوئی نہیں آتا

تجھے اب میرے دُکھ حد سے سوا معلوم ہوتے ہیں
مگر میری زباں پر تو گلہ کوئی نہیں آتا

مصیبت کا یہ دریا پار خود ہی کرنا پڑتا ہے
بچانے کو خُدا یا ناخُدا کوئی نہیں آتا

کبھی یہ حال تھا تیرے سوا سب لوگ مِلتے تھے
اور اب عالَم یہ ہے تیرے سوا کوئی نہیں آتا

نہ اس کو یاد کرتے ہیں نہ اس کو بھول سکتے ہیں
یہ حالت ہے تڑپنے میں مزا کوئی نہیں آتا

یہی کیا کم ہے مَیں دِل سی بَلا کو ساتھ رکھتا ہُوں
اگر اس راہ میں دشتِ بَلا کوئی نہیں آتا

نہ ہو شہزاد اگر دِل میں ارادہ ٹوٹ جانے کا
تو پھر اس راستے میں نقشِ پا کوئی نہیں آتا

——— ۱۵- جون ۱۹۸۷ء

مجھے دیکھو تو مَیں نقشِ کفِ پا جیسا ہُوں
موج میں آؤں تو دریا کی طرح چلتا ہُوں

دو جہانوں کی اُداسی ہے جلو میں میرے
اپنے گھر شام کے سائے کی طرح اُترا ہُوں

لُطف یہ ہے کہ خموشی بھی نہیں ہے طاری
تم کوئی بات سُناتے ہو نہ مَیں سُنتا ہُوں

اس نے تو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا مجھ کو
کسی ڈوبے ہُوئے سُورج کی طرح نکلا ہُوں

نارسائی کا یہ عالم ہے کہ اس گُلشن میں
مَیں تو کانٹوں کو بھی آنکھوں سے لگاتا ہوں

اے دلِ شعبدہ گر ، تیرا ارادہ کیا ہے
تُو ہی کہہ دے کہ مَیں موجود نہیں ہُوں یا ہُوں

مجھے دریا کی طرح روند کے جانے والے
مَیں تری راہ کی دیوار بھی بن سکتا ہُوں

مجھے معلوم ہے اب کوئی نہیں آئے گا
اسی باعث تو مَیں دروازہ کھُلا رکھتا ہُوں

یوں تو ہم دونوں میں ہیں کتنے زمانے حائل
تم بُلاتے ہو تو لمحے میں پلٹ آتا ہُوں

یونہی آباد رہیں کوچہ و بازار ترے
مَیں تو رہگیر ہُوں، آتا ہوں چلا جاتا ہُوں

واپسی کا کوئی رستہ نہیں باقی شہزاد
خود سے مَیں دُور بہت دُور نکل آیا ہُوں

——— ۲۲- جون ۱۹۸۷ء

مرے ہمراہ منزل بھی رواں ہے
مسافر مَیں ہُوں یا سارا جہاں ہے

حقیقت تک رسائی ہی کہاں ہے
یقیں جس کو سمجھتے ہو گماں ہے

وہاں پہنچے جہاں جانا نہیں تھا
سفر جتنا کیا سب رائیگاں ہے

وہاں مَیں ڈھونڈتا ہوں جاودانی
جہاں ہر چیز بے نام و نشاں ہے

بدلتا ہے وہ دن بھر میں کئی رُوپ
فلک شاید چراغوں کا دُھواں ہے

عجب آسیب ہے یہ خانۂ دل
مکیں ہوتے ہوئے خالی مکاں ہے

دہکتا کوئلہ ہے حرفِ مطلب
مگر یہ کوئلہ میری زباں ہے

بچھڑنے کی گھڑی بھی آن پہنچی
مگر اب تک غمِ سُود و زیاں ہے

مرے دل میں چمکتے ہیں ستارے
مرے اندر بھی کوئی آسماں ہے

پہنچنا ہے مجھے اپنے خُدا تک
مگر ساری خدائی درمیاں ہے

یہ کِس کو چُھو لیا شہزادیں نے
سکت دل میں نہ اب ہاتھوں میں جاں ہے

——— ۲۰-جون ۱۹۸۷ء

اُجاڑ ہونے لگیں بستیاں چلا جائے
مگر یہ سوچ رہا ہُوں کہاں چلا جائے

سڑک کے دونوں طرف بے شمار منظر ہیں
رُکوں تو کیسے رُکوں کارواں چلا جائے

نظر اُٹھا کے بھی دیکھا نہ تُو نے میری طرف
ترے بھی شہر سے اے مہرباں چلا جائے

بہت سے لوگ مجھے دے گئے بہت سے دُکھ
جہاں پہ کوئی نہ ہو، اب وہاں چلا جائے

نئے سفر کا ارادہ بھی روز کرتا ہُوں
جو کر چکوں وہ سفر رائیگاں چلا جائے

دلِ ستم زدہ کا اب تو فیصلہ ہے یہی
اندھیری رات ہے آج اُس کے ہاں چلا جائے

تمام لوگ وہاں گفتگو میں ہیں مصروف
اس انجمن میں کوئی بے زباں چلا جائے

جو ڈوبنا ہے تو پھر ڈوبنے سے ڈرنا کیا
سمندروں کے بھی اب درمیاں چلا جائے

زمانہ نیند کے عالم میں ہے سُنے نہ سُنے
کوئی سُناتا ہُوا داستاں چلا جائے

بس ایک تیری تمنّا ہمارے دل میں رہے
ہمارے ہاتھ سے سارا جہاں چلا جائے

نہ جانے کون سے سورج کی زد میں آجائیں
ہمارے سر سے اگر آسماں چلا جائے

مجھے خبر ہے شکایت ہے کشتیوں کو بہت
ہَوا نہ ہو تو کہاں بادباں چلا جائے

یہ کیا کہ ایک ہی الجھن میں روز و شب گزریں
یقین آئے نہ آئے گماں چلا جائے

مجھے یقیں ہے محبّت اسی کو کہتے ہیں
کہ زخم تازہ رہے اور نشاں چلا جائے

تمام رات برستی ہے بادلوں کی طرح
وہ آنکھ جس کی رگوں میں دُھواں چلا جائے

اندھیری رات سہی راستہ تو روشن ہے
چمک رہی ہیں ابھی بجلیاں چلا جائے

تماشا ہونا تھا جو بھی وہ ہو چکا شہزادؔ
بس اب تو ڈوب چکیں کشتیاں چلا جائے

۳۰-جون ۱۹۸۷ء

میری طرف کبھی کبھی رُوئے سُخن بھی چاہیے
اب مرے آفتاب کو کوئی گہن بھی چاہیے

اس کی طرح تنی تنی آج مجھے لگی ہَوا
ایسے غرور کے لیے اس کا بدن بھی چاہیے

تیری طرح تو مَیں نہیں ایک ہی رنگ کا اسیر
وحشتِ دِل کے واسطے شہر بھی، بَن بھی چاہیے

راہ میں کاروانِ غم رُکتا ہے کیوں قدم قدم
پاؤں میں بیڑیاں تو ہیں سر پہ کفن بھی چاہیے

توڑ کے قیدِ وقت کو فصلِ بہار آ گئی
زخمِ کہن تو کھل اُٹھے ، یارِ کہن بھی چاہیے

قافلے سب غبار ہیں، راستے بے شمار ہیں
پاؤں میں لاکھ ہو تھکن، دل میں دُکھن بھی چاہیے

کان میں دِل نے کچھ کہا مَیں نے سُنا تو ہنس دیا
اب، مرے تیرہ بخت کو ایک کرن بھی چاہیے

گھوم چکے نگر نگر ٹکتی نہیں کہیں نظر
لاکھ دیار ہوں مگر، ایک وطن بھی چاہیے

تیری طرح سے کون ہے خاک پہ یوں پڑا ہُوا
اے دلِ منکسر مزاج ، دعوئ فن بھی چاہیے

ہے یہ کہاں لکھا ہُوا، تلخ ہو غم کا ذائقہ
تھوڑی بہت تو لذّتِ کام و دہن بھی چاہیے

دیدۂ مُنتظِر کی جاں! گرچہ ہے شام کا سماں
وسعتِ دشتِ بے اماں! ایک ہرن بھی چاہیے

——— ۱۵-جولائی ۱۹۸۷ء

اب پاس مرے تیرے سوا ہی کوئی آئے
مضمون بھی سوچوں تو نیا ہی کوئی آئے

کون آئے گا اس کلبۂ احزاں میں مرے پاس
مَیں سوچتا ہُوں لب پہ دُعا ہی کوئی آئے

دو دن کے لیے مَیں بھی تو آرام سے بیٹھوں
اس شہرِ تگ و دو پہ تبا ہی کوئی آئے

دُنیا سے انوکھی تو نہیں اس کی تمنّا
ہے ریت کی تحریر، مٹا ہی کوئی آئے

اے دربدری، ہمسفری کس سے کریں ہم
اس راہ میں نقشِ کفِ پا ہی کوئی آئے

جیسے کبھی آجاتے ہیں بھٹکے ہُوئے بادل
ممکن ہے کہ بھُولا ہُوا راہی کوئی آئے

دُنیا کو بہت دیکھ چُکے، جان چُکے ہم
اب مرحلۂ ہوش ربا ہی کوئی آئے

اس دشتِ بلا میں ہو کوئی روکنے والا
مَیں لَوٹتا چاہوں تو صدا ہی کوئی آئے

کہتے ہیں گیا وقت پلٹ کر نہیں آتا
اَور لَوٹ کے آئے تو بَلا ہی کوئی آئے

اے خالقِ انوار مجھے کچھ تو عطا کر
سُورج نہیں دیتا تو دیا ہی کوئی آئے

شہزؔاد کوئی میرے سوا بھی مجھے دیکھے
ہُوں تو مِرے ہونے کی گواہی کوئی آئے

—————— ۱۸- جولائی ۱۹۸۷ء

آسمانوں پہ پھیلا ہُوا یہ نظارہ مجھے دیکھتا ہے
مَیں ستاروں کو تکتا نہیں ہر ستارہ مجھے دیکھتا ہے

مَیں شجر کی طرح راستے میں کھڑا ہوں وہیں کا وہیں
کوئی ایسا نہیں جو پلٹ کر دوبارہ مجھے دیکھتا ہے

جانے کب اپنے پاؤں پہ چلنے کی عادت پڑے گی مجھے
راہ میں ٹُوٹ جاتا ہے جو بھی سہارا مجھے دیکھتا ہے

کیا مرے شہر کے پاس اب دیکھنے کے لیے کُچھ نہیں
مُجھ کو لگتا ہے یوں جس طرح شہر سارا مجھے دیکھتا ہے

راستہ مجھ کو دیتی نہیں، جلتی بجھتی ہوئی روشنی
جب سڑک پار کرنے لگوں سُرخ اشارہ مجھے دیکھتا ہے

جا رہا ہُوں تو لگتا ہے پھر لَوٹ کر مَیں نہیں آؤں گا
کتنے حسرت بھرے پیار سے گھر تمھارا مجھے دیکھتا ہے

وہ مرے سامنے ہے مگر مُجھ کو آتا نہیں ہے نظر
مَیں کہاں ہوں، نہیں کچھ خبر، میرا پیارا مجھے دیکھتا ہے

جان کیسے رہے جان، سو قیامت ہے اک آن میں
مُجھ کو پہچانتا ہی نہیں جو دوبارہ مجھے دیکھتا ہے

ہے اسی میں زماں و مکاں، بچ کے شہزاد جاؤں کہاں
جس غبارے میں مَیں قید ہُوں، وہ غبارہ مجھے دیکھتا ہے

—— ۲۴-جولائی ۱۹۸۷ء

اب کسی کو نہیں معلوم کہ کیا ہونا ہے
ایک لمحے کو بچھڑنا بھی جُدا ہونا ہے

مَیں تو اُس دُھول کو آنکھوں میں لیے پھرتا ہُوں
جس کی تقدیر میں نقشِ کفِ پا ہونا ہے

یار تو منزلِ مقصود سے ہو بھی آئے
اور ابھی تک مجھے پَیروں پہ کھڑا ہونا ہے

ابھی جنگل میں اترنی ہے اندھیرے کی برات
ابھی چڑھتے ہُوئے سُورج کو دیا ہونا ہے

چھپتا پھرتا ہے جو اِس وقت مرے پیروں میں
اسی سائے کو مرے قد سے بڑا ہونا ہے

وہ جو بگڑا ہے تو یہ دُکھ نہیں جھیلا جاتا
اور ابھی سارے زمانے کو خفا ہونا ہے

دلِ محبوبؑ جسے سنگ کہا کرتے ہیں
اسی پتّھر کو کسی روز خُدا ہونا ہے

اے خُدا کوئی ہدف میرا مقدّر ٹھہرے
وہ نشانہ تو نہیں ہوں جو خطا ہونا ہے

ساری دُنیا ہے تباہی کے دہانے کے قریب
اور مَیں سوچ رہا ہُوں مرا کیا ہوتا ہے؟

اے خُدا کوئی تو ہوگا جو تجھے یاد کرے
یوں تو ہر چیز کو دُنیا میں فنا ہونا ہے

سب مری طرح لگاتے ہیں قیافہ شہزاد!
کوئی ایسا نہ ملا، جس کا کہا ہونا ہے

—— ۱۰۔ اگست ۱۹۸۷ء

ڈرتی تھی بہت ابرِ گہربار سے وادی
پانی نے تو مٹّی کی چمک اور بڑھا دی

ہم خاک نشیں خاک سے اُوپر نہیں اُٹھتے
اب چرخ سے اُترے کوئی رہبر کوئی ہادی

دُنیا میں کسی کی بھی نہ سُن اپنی کہے جا
غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی

اِک ڈوبا نہ تھا دوسرا سُورج نکل آیا
اب جائیں کہاں بھیگی ہوئی رات کے عادی

آگاہ کیا اپنے ہی اسرار سے مجھ کو
اُس نے مجھے خاموش نہ رہنے کی سزا دی

گو ہم تجھے اِک لمحہ بھی بھولے نہیں لیکن
لگتا ہے کہ ہم نے تری خواہش ہی مٹا دی

شہزادؔ بڑی چیز ہیں لاہور کے کوچے
اور تُو نے تو گھر بیٹھ کے ہی عمر گنوا دی

——— ۷۔ستمبر ۱۹۸۷ء

اسے مِلنا تو کچھ مشکل نہیں ہے
مگر یہ دِل کسی قابل نہیں ہے

ہم اس کو چھُو کے اک دن دیکھ لیں گے
کوئی دیوار تو حائل نہیں ہے

خدا اُس کا بدن سرسبز رکھے
محبت میں ہوس باطل نہیں ہے

زمانے سے الگ سب سے جُدا تُو
وگرنہ کوئی بھی کامل نہیں ہے

اگرچہ ایک ہی رستہ ہے لیکن
تری منزل، مری منزل نہیں ہے

میَں جس لمحے کو حاصل جانتا ہُوں
وہ لمحہ بھی مجھے حاصل نہیں ہے

مجھے پہلے سے اندازہ تھا اس کا
جو ٹُوٹا ہے وہ میرا دِل نہیں ہے

مثالِ مَوج بڑھتے جا رہے ہیں
سفینوں کا کوئی ساحِل نہیں ہے

زمانے کے اگر قابل نہیں ہیں
زمانہ بھی مرے قابل نہیں ہے

چراغوں سے نہیں ہوتا اُجالا
یہ محفل تو کوئی محفل نہیں ہے

نبھائے جا رہا ہُوں اس سے شہزادؔ
مرے سینے میں شاید دِل نہیں ہے

——— ۹۔ ستمبر ۱۹۸۷ء

گزارنی ہے شبِ ماہتاب مَیں نے بھی
جلا دیے ہیں دِیے بے شمار مَیں نے بھی

ہزار باتوں کی اک بات اس کی آنکھیں ہیں
خموش رہ کے دیا ہے جواب مَیں نے بھی

یہ اور بات ہوئیں میری اُنگلیاں ہی فگار
اسی چمن سے چُنے ہیں گلاب مَیں نے بھی

سبھی چراغ جلے دوسرے کنارے پر
کبھی نہ پار کیا یہ چناب مَیں نے بھی

تری جُدائی کی عادت سی پڑ گئی ہے مجھے
بہت دنوں نہیں دیکھا عذاب مَیں نے بھی

ملے تو تیرے سوا کوئی دھیان میں نہ رہا
کیا تو کر ہی لیا اجتناب مَیں نے بھی

کہیں کا بھی مجھے رہنے نہیں دیا اُس نے
بہت کیا تھا کسی کو خراب مَیں نے بھی

طویل ہوتی گئیں فاصلوں کی زنجیریں
بُھلا دیے تجھے ملنے کے خواب مَیں نے بھی

ورق ورق جو ہَوا لے اُڑی تو غم کیسا
پڑھی نہ تھی کبھی دل کی کتاب مَیں نے بھی

یہ اور بات شبِ غم ابھی نہیں گزری
بنا لیا ہے نیا آفتاب مَیں نے بھی

زمانہ میری طرح نامراد ہے شہزاد
اسے نہ ہونے دیا کامیاب مَیں نے بھی

——— ۲-اکتوبر ۱۹۸۷ء

نکلے ہزار آفتاب دل کا خلا نہ بھر سکا
رات پلٹ کے آگئی، کوئی بھی کچھ نہ کر سکا

چاروں طرف تنی رہی راہ میں درد کی فصیل
رینگتے وقت کے سوا کوئی نہیں گزر سکا

یومِ فراق جس کا نام اس کی نہیں ہے کوئی شام
عمر بسر ہوئی تمام، ایک ہی دن گزر سکا

بادِ سموم جب چلی، پھول جھلس جھلس گئے
سوکھ گئیں ہیں پتیاں رنگ نہیں بکھر سکا

کارگہِ حیات میں ہم بھی عجیب لوگ تھے
کھال اُتر گئی مگر نشّہ نہیں اُتر سکا

—— ۲۱-مارچ ۱۹۸۸ء

ہم جسے ڈھونڈ رہے ہیں تری خوشبو تو نہیں
خوار دُنیا میں کیا جس نے ہمیں تُو تو نہیں

یہی کافی ہے کہ چُپ چاپ گزر جائے عمر
اس محبّت میں کوئی خیر کا پہلُو تو نہیں

دُور تک چھوڑ گیا ایک اندھیرے کی لکیر
یہ ستارہ کوئی بُجھتا ہُوا جُگنُو تو نہیں

کیوں ہر اک شے مجھے دھندلائی ہوئی لگتی ہے
کہیں سیلاب مِری آنکھ کا آنسو تو نہیں

اتنا زخمی ہُوں کہ پرواز نہیں کر سکتا
یہ بکھرتا ہُوا بادل مرا بازُو تو نہیں

روز اس شخص کو مِلنے سے بھی کیا ہوتا ہے
اور جُدائی بھی کِسی درد کا دارُو تو نہیں

جس میں آوارہ ہُوں مَیں دشت نہیں ہے دِل ہے
جس میں آباد ہے تو خواب ہے آنسُو تو نہیں

اپنے ہی پاؤں کی آہٹ سے لرز جاتا ہے
یہ زمانہ کوئی بھٹکا ہُوا آہُو تو نہیں

حُسن اور عشق بھلا ایک سے کیسے ہو جائیں
آخر انصاف کا مفہوم ترازو تو نہیں

اے خدا کچھ تو عطا کر مری خواہش کا عوض
مَیں کوئی خاک پہ بیٹھا ہُوا سادھو تو نہیں

یہ جو دل میں نظر آتے ہیں ستارے شہزادؔ
اس کی آنکھوں کا جگایا ہُوا جادُو تو نہیں

—————— ۲۰۔ مارچ ۱۹۸۸ء

اے مرے دل کی تپش اذنِ سفر دے مجھ کو
تیری قربت ہی کہیں خاک نہ کر دے مجھ کو

تیرے ہوتے مرے اندر یہ خلا کیسا ہے
اپنی محرومی کے احساس سے بھر دے مجھ کو

کہیں مَیں بھی تو نہیں تیری طرح ناموجود
تُو اگر ہے مرے ہونے کی خبر دے مجھ کو

مَیں گنہ گار سہی میری سزا پوری کر
اس زمیں پر وُہی چھوڑا ہُوا گھر دے مجھ کو

یا مرے جُرم کو آفاق تلک پھیلا دے
یا نئی کوئی زمیں کوئی سحر دے مجھ کو

جاننے کے لیے اس دَور میں رکھا کیا ہے
کچھ نہ جو دیکھ سکے ایسی نظر دے مجھ کو

دِل سے دِل تک کوئی جادہ نہ کوئی رستہ ہے
گھر سے گھر تک ہی کوئی راہگزر دے مجھ کو

کیا ضروری ہے وہ آنکھوں پہ بٹھائے رکھے
یہی کافی ہے کہ جینے ہی اگر دے مجھ کو

———— ۳۱-مارچ ۱۹۸۹ء

دُنیا کا نہیں کوئی بھروسہ مِرے مَولا
کیا ہو جو نہ ہو تیرا سہارا مِرے مَولا

ہٹتی نہیں آنکھوں سے اندھیرے کی یہ دیوار
مُجھ کو نظر آتا نہیں رستہ مِرے مَولا

طے کِس سے ہُوئی ہے تنِ تنہا یہ مسافت
لگتا ہے مِرے ساتھ کوئی تھا مِرے مَولا

جو کھویا ہے اس میں مری اپنی ہی خطا تھی
جو پایا ترے نام پہ پایا مرے مولا

کب تک مَیں رہوں دوسروں کے رحم و کرم پر
فریاد ہے فریاد ہے مولا مرے مولا

ممکن تو نہیں بھائی سے بھائی کی لڑائی
لیکن مری آنکھوں نے یہ دیکھا مرے مولا

دعوٰے تو بہت نکتہ شناسی کا ہے مجھ کو
مَیں نیّتِ اغیار نہ سمجھا مرے مولا

آباد نہ کر پایا تھا مَیں خانۂ دل کو
پھر آیا ہے سیلاب کا ریلا مرے مولا

پھیلا ہے مرے چار طرف پانی ہی پانی
مَیں سیلِ بلا خیز میں تنکا مرے مولا

ممکن ہے کہ مطلوب ہوں اس کو مرے آنسو
پیاسا نظر آیا مجھے دریا مرے مولا

تسبیح کے دانوں کی طرح ہم کو پرو دے
اس شہر میں ہر شخص ہے تنہا مرے مولا

———— ۹ - اکتوبر ۱۹۸۸ء

وہ دیکھنا پڑتا ہے کہ دیکھا نہیں جاتا
آنکھوں پہ مگر ہاتھ بھی رکھا نہیں جاتا

مَیں کیسے کہوں تابِ نظر ہے کہ نہیں ہے
جب تک مجھے وہ شخص نظر آ نہیں جاتا

ایک لمحے کی دُوری بھی گوارا نہیں مُجھ کو
اور لَوٹ کے اس در پہ بھی جایا نہیں جاتا

پہلے ہی قدم پر غمِ دُنیا نے صدا دی
رک جاؤ کہ آگے کوئی رستہ نہیں جاتا

مشہور بہت اس کی روانی کے ہیں قِصّے
سچ بات تو یہ ہے کہیں دریا نہیں جاتا

ہم راہ میں دیوار ہی تعمیر کریں گے
ہاتھوں سے تو سیلاب کو روکا نہیں جاتا

پہلے تو چُھپاتے تھے تری چشمِ کرم سے
اب حال ہی ایسا ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

ہے شرط مسافت کے لیے بے خبری کی
انجام ہو کیا یہ کبھی سوچا نہیں جاتا

ہیں فاصلے بھی حُسن کی قربت میں ہزاروں
دُوری کا ہُنر دُور سے سیکھا نہیں جاتا

اِک عمر گزاری ہے مری بے طلبی نے
جس شہر میں اِک دن بھی گزارا نہیں جاتا

اس دل کو ہی ویرانہ بنا رکھا ہے شہزادؔ
اِک عُمر سے مَیں جانبِ صحرا نہیں جاتا

——— ۹۔ دسمبر ۱۹۸۸ء

سفر پر جو بھی نکلا وہ پلٹ کر ہی نہیں آیا
وہی اچھا رہا جو گھر سے باہر ہی نہیں آیا

اِک ایسی رات مَیں نے تیری فرقت میں گزاری ہے
پھر اس کے بعد مجھ کو موت سے ڈر ہی نہیں آیا

مَیں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا
مِرے دروازے تک لیکن سمندر ہی نہیں آیا

مجھے لگتا ہے جتنی عمر گزری رائیگاں گزری
وہ چہرے ہی نہیں دیکھے وہ منظر ہی نہیں آیا

یہ شہرِ غم تھا مَیں نے اپنے دروازے کھُلے رکھے
مجھے تاراج کرنے کوئی لشکر ہی نہیں آیا

تجھے کیسے بتائیں ہجر کی شب کیسے کٹتی ہے
ترے حِصّے میں وہ کانٹوں کا بستر ہی نہیں آیا

لہُو گرما رہے تھے رات کے ٹھٹھرے ہُوئے منظر
پلٹ کر پھر کبھی ماہِ دسمبر ہی نہیں آیا

مجھے دیوار و در کیوں اجنبی محسوس ہوتے ہیں
مَیں یوں گھر میں پڑا ہُوں جس طرح گھر ہی نہیں آیا

حصارِ آرزو تھا یا کوئی جادُو کی بستی تھی
مَیں صدیوں تک چلا دیوار میں دَر ہی نہیں آیا

وہ اِک لمحہ کہ جس میں ہم پلٹ کر دیکھ سکتے ہیں
ہمیں فرصت کا وہ لمحہ میسّر ہی نہیں آیا

وہ اب تک کیا خبر شہزادؔ میری راہ تکتا ہو
مَیں جب آیا تو کچھ اس کو بتا کر ہی نہیں آیا

——— ۲۷-اپریل ۱۹۸۹ء

کٹ ہی جاتا ہے بالآخر فاصلہ کوئی بھی ہو
ہم تری جانب رواں ہیں راستہ کوئی بھی ہو

ہم نے جب کشتی بپھرتے پانیوں میں ڈال دی
پھر خدا کوئی بھی ہو اور ناخدا کوئی بھی ہو

ہم نہیں راضی کسی کو سجدہ کرنے کے لیے
ہم کو نامنظور ہے تیرے سوا کوئی بھی ہو

فیصلہ کیسے ہو کس نے دُکھ اُٹھائے ہیں بہت
زندگی آفت ہے اس میں مبتلا کوئی بھی ہو

اے ہوائے شہر ہم ایسے گئے گزرے نہیں
ہم کو سینے سے لگاتی ہے بُلا کوئی بھی ہو

دل بھی ضدی ہے کسی کی بات سُنتا ہی نہیں
درد کم ہوتا نہیں درد آشنا کوئی بھی ہو

اس بھروسے پر کہ تُو نے ہی پکارا ہے ہمیں
ہم تری جانب لپکتے ہیں صدا کوئی بھی ہو

سب پرندوں کی طرح محتاجِ بال و پر نہیں
جن کو اُڑنا ہے وہ اُڑتے ہیں ہوا کوئی بھی ہو

بات کا رُخ تم بدل دیتے ہو چہرہ دیکھ کر
ہم تو سیدھی بات کرتے ہیں خفا کوئی بھی ہو

وقتِ رخصت جھلملا جاتے ہیں ان آنکھوں میں اشک
اس کا جانا یاد آتا ہے جُدا کوئی بھی ہو

جو قدم شہزاد اُٹھتا ہے وہ رُکتا ہی نہیں
شہر میں جُرمِ محبّت کی سزا کوئی بھی ہو

——— یکم ستمبر ۱۹۸۹ء

اے شبِ ہجر کبھی تُو ہی بتا دے مُجھ کو
ایک سے لگتے ہیں کیوں سارے زمانے مُجھ کو

مُجھ سے وہ دُور بہت دُور ہُوا جاتا ہے
لیے جاتے ہیں کہاں شہر کے رَستے مُجھ کو

اب تو سُورج بھی ستارہ سا نظر آتا ہے
اب تو آنکھوں میں ستارے نہیں چبھتے مُجھ کو

کیا عجب چیز ہیں اِک عُمر کے پالے ہُوئے دُکھ
اب تجھے یاد بھی کرنے نہیں دیتے مُجھ کو

دل کے اندر بھی ہے موجود وہ ناواقف شخص
نظر آتے ہیں کسی اور کے سپنے مُجھ کو

اس طرح مل کہ کسی شئے کی تمنّا نہ رہے
یوں مجھے دیکھ کہ پھر کوئی نہ دیکھے مُجھ کو

پھر بھی دعوٰے نہ کیا مَیں نے شناسائی کا
راہ کے سنگ بھی پہچان چکے تھے مُجھ کو

مدّتوں بعد مِلے ہو تو بس اتنا سُن لو
اِک تمنّا ہے کہ دیتی نہیں مرنے مُجھ کو

مَیں تھا دیوانہ اگر اپنی طرف چل پڑتا
در و دیوار کبھی روک نہ سکتے مُجھ کو

گرم مٹّی پہ تڑپتی ہوئی مچھلی نے کہا
میرے حصّے کا سمندر یہیں دیدے مُجھ کو

اپنے ہی دھیان میں چلتی رہی دنیا شہزادؔ
کون ہوں میں، کبھی پوچھا نہ کسی نے مُجھ کو

——— ۲۶- ستمبر ۱۹۸۹ء

مَیں بھی خورشید ہُوں کیسے نہ نظر آؤں مَیں
اس نے چاہا نظر اندازِ کیا جاؤں مَیں

مَیں نے کیا پایا ہے اس پاؤں کی مٹّی ہو کر
دلِ بے حوصلہ کیسے تجھے سمجھاؤں مَیں

اس کی مرضی ہے کہ مَیں نقشِ کفِ پا ہی رہوں
اور اسی حال میں منزل پہ پہنچ جاؤں مَیں

کون مانے گا مرے دل میں بھی اک سوچ ہے
بات ہی ایسی ہے کرتے ہوئے کتراؤں مَیں

اس قدر روشنیاں ذرّۂ ناچیز میں ہیں
اب یہ خواہش ہے کہ کچھ اور نہ کہلاؤں مَیں

تیرے اور میرے سوا کوئی نہیں ہے موجود
تُو ہی کہہ دے ترا مجرم کِسے ٹھہراؤں مَیں

تجھ کو پالوں کبھی یہ بھی نہیں چاہا مَیں نے
آرزو یہ بھی نہیں ہے تجھے ترساؤں مَیں

شہر کو چھوڑ کے مَیں آ ہی گیا تیری طرف
دشتِ بے فیض کہاں تک تجھے تڑپاؤں مَیں

عمر بھر ایک ہی تصویر نگاہوں میں رہے
داستانِ شبِ غم روز ہی دُہراؤں مَیں

رات اندھیری ہے دُعا کرتے ہُوئے ڈرتا ہُوں
کچُھ نظر آئے تو اس جھولی کو پھیلاؤں مَیں

عُمر شہزاد اسے ڈھونڈتے گزُری لیکن
حال یہ ہے کہ جہاں جاؤں اسے پاؤں مَیں

——— ۲۸ ستمبر ۱۹۸۹ء

یہ سوچ کر اسے ملنا کہ جب ملو گے اسے
اگر وہ کچھ نہ کہے گا تو کیا کہو گے اسے

وہ آگیا تو کب آؤ گے اپنے آپ میں تم
چلا گیا تو جدا کس طرح کرو گے اسے

ابھی تو دھوپ ہے جی بھر کے دیکھ لو اس کو
چراغ لے کے کہاں ڈھونڈتے پھرو گے اسے

وہ روشنی کی طرح ہاتھ کیسے آئے گا
تمام عمر فقط دیکھتے رہو گے اسے

یہ اَور بات کہ جی کا زیاں ہے اس میں بھی
مگر وہ کون ہے تم جان تو سکو گے اسے

وہ ایک خط کہ خزانہ بھی اور سانپ بھی ہے
جلا ہی دو گے مگر یاد تو رکھو گے اسے

عجیب کیف سا ہے شام کی اُداسی میں
وہ رُت پھر آئی ہے کیا دیکھنے چلو گے اسے

تھپک تھپک کے سُلاتے ہو یوں تمنّا کو
کہ جیسے حشر تلک جاگنے نہ دو گے اسے

ہزار بار قلم ٹُوٹ ٹُوٹ جائے گا
جو بات دِل میں ہے تم کس طرح لکھو گے اسے

ستارے جتنے ہیں، کرتے ہیں ایک تال پہ رقص
وہ جانِ نغمہ سہی کس طرح سُنو گے اسے

دلِ فسردہ بھی شہزاد کام کی شے ہے
خیال آئے گا جب خاک کر چکو گے اسے

——— ۴۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء

حال اُس کا ترے چہرے پہ لکھا لگتا ہے
وہ جو چُپ چاپ کھڑا ہے ترا کیا لگتا ہے

یوں تری یاد میں دن رات مگن رہتا ہُوں
دل دھڑکنا ترے قدموں کی صدا لگتا ہے

درد کے پیڑ پہ کچھ پھُول نظر آتے ہیں
ہاتھ تیرا میرے سینے پہ دھرا لگتا ہے

رات اِک خواب کی تصویر بنائی مَیں نے
نقش ایسا ہے کہ نقشِ کفِ پا لگتا ہے

کتنے بے کیف تھے ہم عہدِ خزاں کی صُورت
پھر بہار آئی ہے ہر زخم ہرا لگتا ہے

شور اتنا کہ سُنائی نہیں دیتا کچُھ بھی
دہر کا دہر ہی بے صَوت و صدا لگتا ہے

یوں تو ہر چیز سلامت ہے مری دُنیا میں
اِک تعلّق ہے کہ جو ٹُوٹا ہُوا لگتا ہے

مَیں نے سوچا تھا کہ آباد ہُوں اِک شہر میں مَیں
یاں تو ہر شخص کا انداز جُدا لگتا ہے

مُدّتیں بیت گئیں طے نہ ہوئی منزلِ شوق
ایک عالَم مرے رستے میں پڑا لگتا ہے

اے مرے جذبِ دروں مُجھ میں کشش ہے اتنی
جو خطا ہوتا ہے وہ تیر بھی آ لگتا ہے

جانے مَیں کونسی پستی میں گِرا ہُوں شہزاؔد
اس قدر دُور ہے سُورج کہ دِیا لگتا ہے

———— ۲۱-نومبر ۱۹۸۹ء

نظمیں

نیند اُچاٹ کرنے والی ایک نظم

یاروں نے کہا ’تجھے مَوت آئے‘
سو آئی اور ڈٹ کر آئی
پیاروں نے کہا ’تم زندہ رہو‘
سو ان کی دُعا سے زندہ ہُوں
لیکن یہ راز نہیں کُھلتا
معدوم ہُوں یا پائندہ ہُوں

اے سب کچُھ کر سکنے والے
کچُھ مُجھ کو بھی معلوم تو ہے

ابھی کیا کچھ کرنا باقی ہے

—— جو تیری قضا نے چاہا ہے

یا جینا، مرنا کھیل ہیں سب

آگے بھی رستہ کوئی نہیں

آگے بھی وہی دوراہا ہے

—————— ۴- اپریل ۱۹۸۴ء کراچی

پھر کوئی واپس نہیں آیا

کہاں جاؤ گے ؟

آگے راستہ مسدود ہے لوگو

اب اس کے بعد ہر جانب اندھیرا ہی اندھیرا ہے

اندھیرے میں بہت کچھ ہے

وہ سب کچھ جو ہزاروں سال میں بیتا

وہ سب کچھ جس کی خاطر روشنی میں تم بھٹکتے ہو

یہ کیسی آنکھ ہے ؟

جس کو اندھیرے میں سُجھائی کچھ نہیں دیتا

مری آنکھیں چُرا لو
اور سفر کی ٹھان لو لوگو
اندھیرا راہ کا پتھّر نہیں — جو راستہ روکے
مگر تم جاؤ گے کیسے ؟
تمھارے پاؤں میں ہے روشنی زنجیر کی صورت

یہ پستی کا سفر ہے
اس میں وہ سیڑھی نہیں ہوتی
جو خود چلتی ہے
اور تم بیٹھے بیٹھے
آسماں کو اپنی جانب بھاگتا محسوس کرتے ہو

یہ پستی اس بلندی سے بہت اونچی ہے
جو تم دیکھ پائے ہو !
پہاڑوں پر بہت رستے ہیں
اور ہر راستہ چوٹی کو جاتا ہے
مگر نیچے اُترنے کا سفر !

اس میں کوئی رستہ نہیں

ہر راستہ تم کو بنانا ہے

ذرا ٹھہرو

ابھی سے سوچ لو

اس راستے سے پھر کوئی واپس نہیں آیا

١٦-جولائی ١٩٨٤

پھر صُبح ہو رہی ہے

پھر صُبح ہو رہی ہے

پھر آسمان دل کی کالک کو دھو رہا ہے

اور رتجگا پھر اپنی آنکھیں بھگو رہا ہے

سورج چُھپا ہُوا ہے اور چاند سو رہا ہے

گلشن مہک رہے ہیں پنچھی چہک رہے ہیں

سبزہ لہک رہا ہے غنچے چٹک رہے ہیں

اور میرے دل کے اندر وہ غم دہک رہے ہیں

جو رات نے دیئے ہیں

پچھلی شبوں کی صُورت

اس رات نے بھی مجھ پر کچھ ظلم ہی کیے ہیں
یہ رات تھی کہ روزِ محشر گزر گیا ہے
اور دل کی بستیوں کو — پہلے سے بھی زیادہ
ویران کر گیا ہے
دل کی فصیل ڈھا کر سیلاب اُتر گیا ہے

پھر صُبح ہو رہی ہے
پھر اِک پہاڑ سا دِن رَستے میں آ پڑا ہے
رستے چمک اُٹھے ہیں، آنکھیں اُجڑ گئی ہیں
بیٹھے بٹھائے پھر سے سانسیں اُکھڑ گئی ہیں

روز اِک نیا جہاں ہے اور اس میں مَیں اکیلا
سیلاب سا رواں ہے اور اس میں مَیں اکیلا
چاروں طرف دُھواں ہے اور اس میں مَیں اکیلا
صحرائے بے اماں ہے اور اس میں مَیں اکیلا

صبح و مسا یہی کچھ دل پر گزر رہا ہے
اِک سَیل چڑھ رہا ہے اِک سَیل اُتر رہا ہے

ایک دائرہ ہے جس میں ہر چیز گھومتی ہے

ہے رقص میں یہ عالم تصویر جھومتی ہے

اب دن بھی ایک جیسے راتیں بھی ایک جیسی

ہوتی ہیں اپنے دل سے باتیں بھی ایک جیسی

سو بار مَیں نے چاہا ٹوٹا نہیں یہ دھاگا

دن بھر بھی جاگتا ہے مَیں رات بھر بھی جاگا

مخلوق سو رہی ہے

پھر صُبح ہو رہی ہے

۱۸-۱۹- جولائی ۱۹۸۴ء

ابھی تُو نے دیکھا نہیں

ابھی تُو نے دیکھا نہیں آسماں کی طرف
ابھی تُو زمینوں کے ذرّوں میں مصروف ہے
ابھی تُو نے سوچا نہیں
یہ ستارے بہت دُور رہتے ہُوئے بھی
بہت پاس کیوں ہیں ؟
ابھی چاند کا آئینہ اتنا شفاف کیوں ہے

زمیں اپنے سینے پہ کہسار کا بوجھ لادے
کدھر جا رہی ہے !

یہ جھیلیں جو گدلا چکی ہیں
سسکتی ہُوئی زرد دھرتی کے ناسور ہیں
اور یہ فصلیں جو اس وقت شاداب ہیں
کل جھلس جائیں گی

کل جو آیا نہیں
سب کی نظریں اسی پر لگی ہیں
مگر آج، جو آج موجود ہے کتنا بے مایہ ہے

وقت کی لہر بھی کیا عجب چیز ہے
جب گزرتی ہے احساس تک ہم کو ہوتا نہیں ہے
اور کہنے کو ہم بھی اسی لہر کے منتظر ہیں

—————— ۵-اگست ۱۹۸۴ء

اکائی

کسی نقطے سے آغازِ سفر کرنا پڑے گا
خواہ یہ نقطہ

زمیں و آسماں کی سربلندی سے بھی اونچا ہو

مگر اتنی بلندی پر پہنچ کر کس طرف جاؤں گا میں ؟
کیا کوئی رستہ —

فرازِ عرش سے آگے بھی جاتا ہے؟
اگر یہ راستہ موجود ہے
تو غیب کی کالی کتابوں میں
کہیں کچھ ذکر تو ہو گا
اشارے میں کنائے میں!

بہت دیکھا کتابوں میں
بہت ڈھونڈا اشاروں میں کنایوں میں
مگر کوئی صدا آتی نہیں
کوئی مجھے کہتا نہیں
"میں اس طرف ہوں
تیرے زخمی ہاتھ کی جانب"

مگر یہ ہاتھ تو شل ہے
اب اس میں زور باقی ہے نہ کس بل ہے
مرے دو پاؤں میں بھی ایک پاؤں
سنگ کی مانند بے حس ہے

مگر مَیں نے سُنا تھا

پتّھروں میں جان ہوتی ہے

بہت سے پتّھروں میں ایک پتّھر

میرے دل میں بھی دھڑکتا ہے

مرے سینے کے زنداں میں

پرندہ سا پھڑکتا ہے

مگر یہ ایک رُخ ہے !

دوسری جانب

مجھے اپنے بدن کی وسعتوں سے خوف آتا ہے

مرے اِک سمت سورج

دوسری جانب ستارے ہیں

مرے پاؤں کے نیچے اِک سمندر موجزن ہے

اور سر پر آسمانوں کی بلندی ہے

مَیں نقطوں میں گھِرا ہُوں

ہر طرف نقطے ہی نقطے ہیں

کسی نقطے سے آغازِ سفر کرنا پڑے گا !
کاش یہ نقطے
سمٹ کر ایک ہو جاتے

——————— ۲۰-جنوری ۱۹۸۶ء

سنگ ریزے

مَیں —— مری جلتی ہوئی آنکھیں

مرے بے جان ہونٹ

کتنے پتھّر ہیں —— جو تیرے ہاتھ کے محتاج ہیں

چاہتے ہیں تو مسیحائی کرے

اِک جھلک دِکھلا کے، ہر اک شئے کو سودائی کرے

پتھّروں میں مُورتیں ہیں

مُورتوں میں جان ہے

روشنی اس تیرگی میں اس قدر ہے
آدمی حیران ہے

کاش تو ان پتھروں کے دل کی دھڑکن سُن سکے
کاش تو اس آسماں سے کچھ ستارے چُن سکے

۱۹۶۲ء
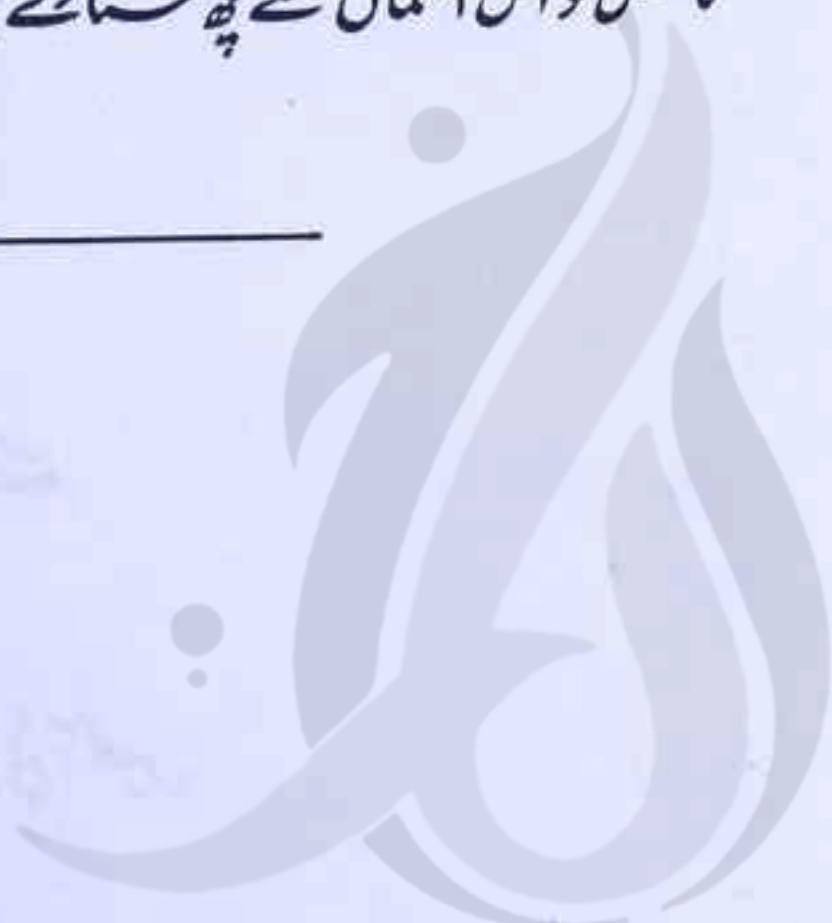
یہ تمنّا عبث

اسے دیکھنے کی تمنا عبث
وہ کیسا لگے گا؟
ابھی دھندلی دھندلی لکیروں نے چہرہ بنایا نہیں
ابھی اس کی آواز بھی ریشہ ریشہ ہے
اس نے گزرتی ہوئی ساعتوں کو بتایا نہیں
ابھی برف کی تہ کے نیچے ہیں آنکھوں کی جھیلیں
ابھی جھیل کی مچھلیاں زرد سورج کی کرنوں سے محروم ہیں

مگر کیا خبر!
وہ ازل سے ابد تک اسی کیفیت میں رہے

یا مری آنکھ ــــ

اس کی بدلتی ہوئی رنگتوں سے شناسا نہ ہو

میں اسے کیوں ادھورا کہوں

میری آنکھیں ہی شاید مکمل نہ ہوں

یہی سوچتے سوچتے مجھ کو نیند آ گئی

اور ہوا دیر تک میرے کانوں میں کہتی رہی

"دیکھ لے، دیکھ لے"

مَیں نے گھبرا کے آنکھیں اُٹھائیں

وہاں تیرگی کے سوا ــــ اور کوئی نہ تھا

مَیں نے دِل سے کہا

"رات کافی پڑی ہے ابھی سو رہیں

ــــ سو رہیں"

ابھی نیند کا پہلا جھونکا بھی آیا نہ تھا

پھر ہوا نے کہا

'دیکھ لے، دیکھ لے'

خامشی رنگ ہے

رتیرگی کی صدا سنگ ہے

ہنستے مٹتے ہُوئے روز و شب

— نقشِ پا سے زیادہ نہیں

اور تُو سوچتا ہے کہ تکمیل ہو

چہرے اتنے شناسا ہوں تو ان کو پہچان لے

یہ تمنّا عبث"

——— غالباً ۱۹۶۱ء

اجنبی کون ہے تُو؟

(کشمیر کے پس منظر میں ایک نظم)

اجنبی کون ہے تُو؟
مُدّتیں بیت گئیں مَیں نہ تجھے جان سکا
اجنبی کون ہے تُو؟
تیری آنکھوں میں حیا ہے نہ حمیت کی جھلک
تیرے دل میں نہ شجاعت نہ محبّت کی چمک
تیری پیشانی پہ رسوائی کا کالا ٹیکا
زرد چہرے پہ ہیں اِک عمر کی ذلّت کے نشاں

قہقہے گونجتے ہیں تیرے، مری وادی میں
لیکن ان میں بھی ہے پوشیدہ خزاں
تجھ میں اور مجھ میں بھلا کیا رشتہ؟
میری خوشبو تری سانسوں میں کہاں؟
روندنے تو مجھے آپہنچا ہے — لیکن پھر بھی
میری مٹّی پہ نہیں ہیں ترے قدموں کے نشاں
تو چھلاوہ ہے کہ آسیب ہے آخر کیا ہے؟
اجنبی کون ہے تُو؟

میری صنّاعی کا مدّاح زمانہ سارا
کھیتیاں، جھیلیں، مہکتے ہوئے باغ
چاندنی سے بھی ہے شفّاف مرے پاؤں کی دھول
تجھ سے دُوری مرا مقصود — اصول
تیری قربت نہیں اک لمحہ قبول
تُو دھواں زرد چٹانوں جیسا
سانس گھٹتا ہے مرا
اپنا ناپاک بدن میری زمیں سے لے جا

مدّتیں بیت گئیں تُو نہ مجھے جان سکا
اجنبی کون ہے تُو؟

دیکھ ہر سمت سے شعلے اُٹھے
آگ کے پھُول کِھلے شاخوں پر
خلق کے شور سے دھرتی کانپی
جاگ اُٹھی ہر بستی
پھٹ پڑے سینۂ گیتی سے کئی فوّارے
خون اور عزم کی کرنیں پھُوٹیں
اس سے پہلے کہ یہ شعلہ تجھ کو —
تیری نسلوں کو جلا کر رکھ دے
اپنے دامن کو بچا
مُدّتیں بِیت گئیں تو نہ مجھے جان سکا
اجنبی کون ہے تُو؟

——— ستمبر ۱۹۶۵ء

نثری نظمیں

اپنی سالگرہ پر ایک نظم

جب مجھے اپنا زائچہ بنانا آتا تھا
تو میری اُنگلیاں بہت مضبوط تھیں
ستارے آسمان کی بجائے
میرے ہاتھ سے لکھے ہوئے کاغذ پر گردش کرتے تھے
میرے بارہ گھر تھے اور ہر گھر میں

کوئی نہ کوئی ستارہ
دربانی کے فرائض ضرور انجام دیتا تھا

پھر مَیں نے ان گھروں کو مسمار کر دیا
دربانوں کو نوکری سے ہٹا دیا
اور تب سے اب تک مَیں اُن کا غلام ہُوں
وہ میرے لیے راستہ متعین کرتے ہیں
اور مَیں پا بہ زنجیر صرف اس سمت میں سفر کر سکتا ہُوں
جس طرف مجھے کھینچا جا رہا ہو۔

مگر اب مشکل یہ آ پڑی ہے
کہ بارہ کے بارہ گھر ——
مجھے مختلف سمتوں میں کھینچتے ہیں
اس لیے مجھے کچھ خبر نہیں ہوتی
کہ مَیں کس طرف جا رہا ہوں
اس اندھے کی طرح جس نے شراب پی لی ہو
اور پیچدار گلیوں میں گھر کا رستہ بھول گیا ہو

اب تو صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے
کہ یہ بارہ کے بارہ آقا
مُجھ غلام کو اس شدّت سے اپنی اپنی طرف کھینچیں
کہ میرا بند بند ٹوٹ جائے
اور یوں مجھے غلامی اور ان کو آقائی سے نجات مل جائے

—————— ۱۶-اپریل ۱۹۸۵ء

پھر یُوں ہُوا

جب وہ پہلی بار مجھے ملی تھی
تو مَیں نے اسے بالکل لفٹ نہ دی
مگر وہ ملتی رہی
شہر کے ہنگاموں میں
انٹلکچول لوگوں کی بور محفلوں میں
وہ ہر بات کو غور سے سُنتی تھی
مگر مجھے اس کا یہ راز معلوم تھا

کہ وہ سُنتی ہے نہ سمجھتی ہے
سوچنا تو خیر اُس کے بس کی بات ہی نہ تھی

جب بحث بہت اُلجھ جاتی
تو وہ مسکرانے لگتی
یوں لگتا کہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پینٹ کر دی گئی ہے
مجھے اس پر رحم آتا
کہ آخر ہم جیسے بے ہنر لوگوں کی
بے معنی باتیں برداشت کرتے چلے جانا
آخر کونسی جبلّی مجبوری ہے

پھر یوں ہُوا
ایک دن جب مَیں اسے مِلا
تو وہ واقعی تنہا تھی
بہت دیر تک ہمیں گفتگو کرنے کے لیے
کوئی موضوع نہ مِل سکا
موسم بھی ایسا نہیں تھا کہ ہم اس کے بارے میں باتیں کرتے

پھر مَیں یونہی اپنی نشست سے اُٹھا
اور کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کر دیا
اچانک مجھے سسکیوں کی آواز آئی
مَیں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ رو رہی تھی
مَیں نے محسوس کیا کہ آنسوؤں نے
اس کے چہرے پر پینٹ کی گئی مسکراہٹ کو دھو دیا ہے
وہ اب ایک ایسی سیکنڈ ہینڈ کار کی طرح نظر آتی تھی
جس کا آخری پینٹ اُتر گیا ہو۔
اور پرانے پینٹ نے پھر سے چغلی کھانی شروع کر دی ہو

مَیں آہستہ آہستہ اس کے پاس گیا
اور ڈرتے ڈرتے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا
وُہ بُری طرح کانپ رہی تھی
مَیں دیر تک بغیر کُچھ کہے
اسے تسلّی دینے کی کوشش کرتا رہا
وُہ یکایک اُٹھی
اور تیزی سے باتھ روم کے دروازے کی جانب بڑھی

پھر وہ کافی دیر کے بعد واپس آئی
تو اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ موجود تھی
جو اس کی شخصیت کا نشان بن چکی تھی
میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اسے کیا کہوں
یونہی خاموشی توڑنے کے لیے میں نے اسے پوچھا
تم اب کیسی ہو؟
اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی
پھر میں نے سوچا
اس سارے انٹلکٹ کا کیا فائدہ
جب میں ایک عورت کو بھی نہ سمجھ پایا

اور اب وہ عورت میرے اندر
فنگس کی طرح پھیل گئی ہے
اور میں نے محفلوں میں جانا چھوڑ دیا ہے

——— ۲- اکتوبر ۱۹۸۲ء

ہَوا سمندر ہے

مجُھ سے کہا گیا ہے
کہ مَیں اب وہ نہیں ہوں جو پیدا ہُوا تھا
اب مَیں ایک صفر ہُوں
جس کے ساتھ کوئی عدد موجود نہیں
یہ منزل ہونے نہ ہونے کے درمیان
ایک اُڑتے ہوئے پرندے کی طرح ہے
یہ پرندہ اڑتا نہیں، ہَوا میں تیرتا ہے
مگر مَیں کیا کروں، مجھے تیرنا نہیں آتا

اور ہَوا سمندر سے کہیں زیادہ گہری ہے
ہَوا میں ڈوب کر مرنا
سمندر میں ڈوب کر مرنے سے کہیں زیادہ خوفناک ہے

مُجھ سے کہا گیا ہے
کہ ہم نے تیرے لیے ایک عورت منتخب کی ہے
اب مجھے وہ نام اختیار کرنا ہے
جس کو زنجیر کرنے کے لیے وہ پیدا ہوئی تھی
مجھے اس کے گھر میں رہنا ہے
اس کے بچّوں کی پرورش کرنی ہے
فائلوں پر لمبے لمبے نوٹ لکھنے ہیں
پھر چھپے ہُوئے کاغذ لے کر رزق کی تلاش کرنی ہے

اور جب مَیں بازار میں آتا ہُوں
تو ہَوا میرا راستہ روک لیتی ہے
اب میرے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں
کہ مَیں اس دیوار کو پھاند جاؤں

مگر مجھے اڑنا نہیں آتا

صرف ڈوبنا آتا ہے

مگر سمندر میں ڈوبنا ایک روایت ہے

اور مَیں روایت کا پابند نہیں

اس لیے مَیں نے ڈوبنے کے لیے ہَوا کا انتخاب کیا ہے

———— ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۸۲

طویل نظم

ساقی نامہ

پلا ساقیا زہر کا ایک جام
نہیں زندگی میں مرا کوئی کام
ترا بادۂ ہوش بے کار ہے
زمیں اپنی ہستی سے بیزار ہے
ستارے حقارت کی تصویر ہیں
زمانے بڑی سخت زنجیر ہیں
کسی طور اب وقت کٹتا نہیں
کلیجہ چٹختا ہے پھٹتا نہیں

جوالامکھی گرچہ خاموش ہے
مگر اس کے اندر بڑا جوش ہے
نہ جانے یہ آتش فشاں کب بنے
کہ بھڑکا دیا ہے اسے وقت نے
اگر چارہ گر ہو تو چارہ کرو
نہیں تو جہاں سے کنارہ کرو
محبّت کی امید کو چھوڑ دو
کھلونا ہے یہ دِل اسے توڑ دو
زمیں چند لمحوں کی مہمان ہے
کوئی دل میں باقی جو ارمان ہے
تو بچّوں کی مانند پورا کرو
ستاروں کو ہر وقت گھُورا کرو
نہ جانے وہاں کون آباد ہو
کوئی شاید ان میں بھی شہزاد ہو
جو ہر بات پر تلملاتا رہے
یونہی جان اپنی کھپاتا رہے

رہے جاگتا صُبح کے نام پر
مگر آنکھ رکھتا ہو انجام پر

وہاں بھی ہو شاید یہی برہمی
نہیں میری دُنیا میں جس کی کمی

مرا دیوتا آج اخبار ہے
جو نفرت کی باتوں کا انبار ہے

سُناتا ہے کیا کیا فسانے مجھے
دکھاتا ہے کیا کیا زمانے مجھے

وہی جنگ کی روز تیّاریاں
وہی اہلِ طاقت کی عیّاریاں

جسے جو ملا وہ وہی کھا گیا
مگر دوسرا اس پہ غرّا گیا

لڑیں رات دن مست ہاتھی لڑیں
مگر میرے کھیتوں پہ کیوں آ پڑیں

یہ ٹکڑا زمیں کا مرا مان ہے
مری زندگی ہے مری جان ہے

لہو دے کے سینچی ہیں یہ کھیتیاں
بہالے چلا جن کو سیلِ رواں
مَیں تکتا رہا اور مرے سامنے
کئی رنگ بدلے ہیں اس دام نے
ابھی تھا سنہرا ابھی ملگجا
ذرا دیر میں کیا سے کیا ہو گیا
مَیں کل اپنی قسمت کا مختار تھا
مگر آج ایندھن بنا جنگ کا
جہاں جی میں آئے مجھے جھونک دو
مگر اس قدر سوچ کر دوستو
خُدا آسمانوں پہ موجود ہے
زمینوں کا انسان معبود ہے
مرا فیصلہ غیر کے ہات میں
عجب آگ برسی ہے برسات میں
گری بوند اور اس کو بھڑکا گئی
مجھے شاید اپنی نظر کھا گئی

تغیّر عجب میرے اندر ہوئے

نرالے مِرے تو مقدّر ہوئے

گوارا نہ تھی جو غلامی مجھے

وہی بن گئی نیک نامی مجھے

مجھے اپنا بازو بتاتے ہو تم

مگر زور مجھ کو دِکھاتے ہو تم

اگر وقت آیا تو مَیں کٹ گیا

ہَوا آئی ، بادل تھا مَیں چھٹ گیا

کہاں لے چلی یہ ہَوا کیا کہیں

ہم اس درد کا ماجرا کیا کہیں

تھے دیوار کل آج تِنکے ہُوئے

ہُوئے تخت اور تاج تِنکے ہوئے

مشینیں خُدا بن گئیں کیا کریں

صفیں ہر طرف تن گئیں کیا کریں

اُدھر برف کے سرد میدان سے

اُٹھے ہیں بگولے بڑی شان سے

لبوں پر ہے گو نام جمہور کا
گلا گھونٹ دیتے ہیں مجبور کا
زمیں سے اُڑے آسماں تک گئے
یہی پیکرِ گِل کہاں تک گئے
گھڑی پَل میں فخرِ زمانہ ہُوئے
خداؤں سے بڑھ کر توانا ہُوئے
وہ لیتے رہے امن کا نام بھی
مگر کوئی چھوڑا نہیں کام بھی
جہاں پاؤں رکھا زمیں چھین لی
جو دھرتی ملی دِل نشیں چھین لی
پہ الزام خود پر نہ آنے دیا
کبھی اپنے مُہروں کو آگے کیا
کبھی فلسفہ ان کا ہتھیار تھا
کبھی پیٹ ہر شئے کا معیار تھا
جسے دوست اپنا کہا دھر لیا
زمانے کو قائل مگر کر لیا

کوئی خوف سے بولتا ہی نہیں

جھکی ان کے دَر پر جہاں کی جبیں

رسائی میں جس کے ستارے بھی ہوں

جسے فلسفے اپنے پیارے بھی ہوں

وہ کمزور جانوں کو آنکھیں دِکھائے

وہ غصّے میں ہر چیز پر تلملائے

تشدّد کرے امن کے نام پر

رہے اپنے انجام سے بے خبر

اِدھر ایشیا بال کھولے ہُوئے

اِدھر وہ نئے جال کھولے ہُوئے

یہ بھُوکا پرندہ ہے دانہ دکھاؤ

نہ آئے تو اس کو نشانہ بناؤ

مگر یہ کسی طور جانے نہ پائے

کبھی اس کو آرام آنے نہ پائے

ہے اِک کھینچا تانی میں ہر ایک شَے

خُدا دو ہیں لیکن زمیں ایک ہے

پلا ساقیا! زہر سے تلخ تر

مرے دوش پر ہے ابھی میرا سر

ہیولوں کا چکّر مرے سر میں ہے

مگر جام خالی مرے گھر میں ہے

فقط ایک ذرّے میں ہے کائنات

مگر ایک ذرّہ نہیں شش جہات

یہی قوّتِ بازوے زندگی

اسی سے جہانوں میں تابندگی

اسی سے ہے شقِ سینۂ کائنات

اسی کے سبب عرصۂ ممکنات

جو ذرّے کو پھوڑوں جہاں کانپ اُٹھے

مثالِ دلِ ناتواں کانپ اُٹھے

مرے ہاتھ میں سب کی تقدیر ہے

مرا خواب خود اپنی تعبیر ہے

مگر خواب کے رنگ بدلے ہُوئے

کبھی صاف تھے آج گدلے ہُوئے

اگرچہ مَیں دُنیا کی معراج ہُوں
مگر مثلِ اندھوں کے محتاج ہُوں
کوئی روشنی چھین کر لے گیا
مری زندگی چھین کر لے گیا
مجھے دیو ہیکل بنانے کے بعد
خُدائی کے منظر دکھانے کے بعد
مری سادگی کو چُرا لے گیا
مرے رنگ سارے اُڑا لے گیا
وہ منظر وہ رنگ اب کہاں اب کہاں
ذرا سے بھی باقی نہیں سب کہاں
مرا دل چراغِ چمن زار تھا
مگر میری اک پھونک سے بُجھ گیا
مَیں اندھا ہُوں یا جگ اندھیرا ہُوا
مجھے وسوسوں نے ہے گھیرا ہُوا
مَیں بکھرا ہُوا رہگزاروں میں ہُوں
زمیں پر ہُوں کچھ، کچھ ستاروں میں ہُوں

زمیں سے فلک تک جو ہے راستہ

مرے پاؤں کی گرد بننے لگا

مگر پاؤں کی گرد خود بھی ہوں میں

دلوں کی طرح سرد خود بھی ہوں میں

میں اپنے لیے آپ دیوار ہوں

خود اپنے قفس میں گرفتار ہوں

پرندہ ہوں میں پھڑپھڑاتا نہیں

مجھے کوئی موسم جگاتا نہیں

مری نیند اک عہد کی نیند ہے

مرے ساتھ ہی سو گئی میری نے

صدا کوئی آتی نہیں کیا کروں

یہ دبدھا ہے میں فیصلہ کیا کروں

مری رُوح جیسے بدن میں نہیں

مری لاش میرے کفن میں نہیں

مرا سانس سینے میں اٹکا ہوا

ہے منصور سُولی پہ لٹکا ہوا

مرے ذرّے مجھ سے جدا ہو گئے

مرے دست و بازو ہوا ہو گئے

مرا زہر دریاؤں میں مل گیا

مرا زخم گُل کی طرح کھل گیا

حقارت کا منظر چمن بن گیا

جو کچھ بھی نہ تھا کوہکن بن گیا

پہاڑوں سے نہریں نکالی گئیں

زمیں سے شرابیں اُچھالی گئیں

دکھائے گئے خواب اُمید کے

چھلکنے لگے جام جمشید کے

ہر اِک سمت مجھ کو بُلاتی رہی

نئے روز منظر دکھاتی رہی

مَیں حیران تھا کس طرف جاؤں مَیں

اماں کون سے کُنج میں پاؤں مَیں

مرے باغ ہر دم اُجڑنے لگے

قدم میرے اُلٹے ہی پڑنے لگے

مری آنکھ کے سامنے گرد ہے
شفق کی بھی رنگت ابھی زرد ہے
فلک اپنی گردش بدلتا نہیں
زمیں سے بھی شعلہ نکلتا نہیں
مری رُوح بھی جگمگاتی نہیں
کہیں سے کرن کوئی آتی نہیں
مری خاک نم کو ترسنے لگی
خُدا کو، صنم کو ترسنے لگی
مجھے بس ہیولے دکھائی دیے
ہواؤں کے نوحے سُنائی دیے
گیا وقت میرے لیے بار ہے
اسی قید میں دِل گرفتار ہے
مزہ اب مئے ناب میں کچھ نہیں
حلاوت کسی باب میں کچھ نہیں
مجھے ساقیا تُو پلائے گا کیا
نشہ رُوح کو گدگدائے گا کیا

بڑی چیز ہے یہ مگر کچھ نہیں
کرے گا اثر سنگ پر کچھ نہیں
ترا میکدہ بند ہونے کو ہے
فنا تیری سوگند ہونے کو ہے
مرے آج پیشِ نظر کچھ نہیں
کل آئے نہ آئے، خبر کچھ نہیں
مری خاطر اتنی دعائیں نہ کر
ہُوا جو ہُوا ـــــ درگزر، درگزر
مرے خُوب اور زشت کو بھول جا
مَیں کیا چیز ہُوں؟ خود نہیں جانتا
مجھے جنّتوں سے نکالا گیا
تباہی کی خاطر ہی پالا گیا
مجھے زندگی اس لیے دی گئی
مری ذات سے دشمنی کی گئی
شعور اس لیے مجھ کو بخشا گیا
کہ مَیں اپنی ذلّت کو پہچانتا

سو مَیں جانتا ہُوں کہ مَیں کچھ نہیں
بس اب مانتا ہُوں کہ مَیں کچھ نہیں
خُدا کے لیے کوئی تدبیر کر
مِرے دوش پر ہے ابھی میرا سر
شگوں سے کوئی دم بسر کر سکوں
وہ شَے دے کہ آرام سے مر سکوں

دسمبر ۱۹۶۱ء

فہرست

غزلیں

نظمیں

نثری نظمیں

طویل نظم

پاکستان بننے کے فوراً بعد جو نام اردو شاعری میں متعارف ہوئے ان میں شہزاد احمد کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے' وہ ان شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے غزل کے کلاسیکی لب و لہجے کو تبدیل کرنے کے باوجود روایت کے ساتھ اپنا رشتہ پوری طرح قائم رکھا ہے' ان کے بنیادی موضوعات انسانی سائیکی سے تعلق رکھتے ہیں' انہی کے اٹھائے ہوئے سوال ابھی تک جدید غزل کے بنیادی سوال ہیں۔

سائنس اور فلسفے کے گہرے مطالعے نے ان کی شاعری کے اندر بہت سی ایسی سمتیں پیدا کر دی ہیں جو اردو شاعری کے لیے نئی بھی ہیں اور خوش آئند بھی۔ ان کی شاعری کا تعلق بیک وقت جہان صغیر اور جہان کبیر سے ہے۔ اس لئے آنکھ اور دل کے استعارے ان کے ہاں معانی کی کئی پرتیں لئے ہوئے ہیں وہ ایک جداگانہ شخصیت' لب و لہجہ اور طرز احساس رکھتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

- ندیم کی غزلیں (کلیات)
- ندیم کی نظمیں۔ اوّل، دوم (کلیات)

قتیل شفائی

- جھومر
- ھریالی
- رنگ۔ خوشبو۔ روشنی (کلیاتِ گیت)

کشور ناہید

- بے نام مسافت
- لب گویا
- سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ

حسن رضوی

- کبھی کتابوں میں پھول رکھنا
- کوئی آنے والا ہے

اختر ہوشیار پوری

- سمت نما

نجم الثاقب

- رتیلے خوابوں کی رُت

عمر فیضی

- نغمہ

شہزاد احمد

- دیوار پر دستک

زندگی کے بارے میں کچھ حقائق ایسے بھی ہوتے ہیں' جنہیں صرف موت ہی کے حوالے سے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے' شاید اسی لئے سارتر نے کہا تھا کہ فنکار صحیح معنوں میں فنکار بنتا ہی اس وقت ہے جب وہ موت کو بہت قریب سے دیکھ لیتا ہے۔ موت کے تجربے سے گزرنا بجائے خود ایک تخلیقی عمل ہے' شہزاد احمد کا نیا مجموعہ کلام "ٹوٹا ہوا پل" اس تخلیقی تجربے کو بیان کرتا ہے' مارچ 1984ء میں شہزاد احمد پر ہارٹ اٹیک ہوا' اور چند ہی لمحوں میں اس کی موت واقع ہو گئی' پھر مصنوعی طریقے سے اس کے دل کو چلایا گیا' وہ ایک طویل عرصے تک زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار رہا' "ٹوٹا ہوا پل" کی اکثر غزلیں اور نظمیں اس زمانے میں لکھی گئی ہیں۔ لہٰذا ان میں جو تجربہ بیان ہوا ہے وہ اس لحاظ سے مختلف ہے کہ بہت کم شاعر اس تجربے سے گزرے ہیں' مگر شہزاد احمد' نے اسے جس آسانی اور سہولت سے بیان کر دیا ہے اس کی وجہ سے یہ واقعہ غیرمانوس محسوس نہیں ہوتا۔ موت اور زندگی کے کئی پہلو ایسے ہیں، جو شاعری کی زبان میں ڈھل کر ایک تخلیقی واردات کی شکل میں ان منظومات میں محفوظ ہو گئے۔ یہ ایک وقت میں شاعری' موت اور زندگی کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں یہ سبھی کچھ اکائی کی صورت اختیار کر گیا ہے' اب ان اجزاء کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا' لیکن کبھی کبھی تخلیقی لمحے کے دوران ان رنگوں کو ایک دوسرے سے جدا ہوتے اور ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہوئے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

Rs. 120.00

ISBN - 969 - 35 - 0089 -X